مقالاتِ تحقیق

ڈاکٹر وحید قریشی

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور

مقالاتِ تحقیق

ڈاکٹر وحید قریشی

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

سلسلۂ مطبوعات : ۴۳

o

طبع اول : مارچ ۱۹۸۸ء
تعداد : ایک ہزار

طابع
مطبع : گیکسی پریس ،
۲ - لنک میکلوڈ روڈ ، لاہور ۔

ناشر : مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
۳۰/ے۔این - سمن آباد
لاہور—۶۔۵۴۵۰۰

نوٹ : اکادمی ادبیات پاکستان ، اسلام آباد نے اس کتاب کے لیے مالی وسائل مہیا کر کے اس کی اشاعت کو ممکن بنایا ۔

o

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یاد میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترتیب

(۱)

پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال ۱۹۵۸—۱۹۶۸ ۹

پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ ۲۳

(۲)

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ۳۱

دیوان شوق ـ ایک جائزہ ۳۹

(۳)

حالات حسن کے دو ماخذ ۴۷

سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ ۶۵

میر حسن اور سحرالبیان ۸۳

خوان نعمت ـ ایک محاکمہ ۹۷

مقدمہ مثنویات میر حسن ۱۰۷

جہاندار شاہ ۱۳۳

(۴)

مقدمہ کلام آتش ـ ایک جائزہ ۱۷۳

گلستان سخن ـ ایک تجزیہ ۱۸۱

(۵)

بنیادی اردو ـ ایک تجزیہ ۲۳۷

حوالہ جات قانون فوجداری پر ایک طائرانہ نظر ۲۴۳

مشرق میں فہرست سازی کی روایت ۲۴۹

کتابیات تحقیق و تنقید ۲۵۷

کتاب نامۂ شبلی پر ایک نظر ۲۶۱

(۶)

فن تاریخ گوئی ۲۶۳

پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال

(۱۹۵۸ء - ۱۹۶۸ء)

(۱)

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز یوں تو دور سرسید سے ہوتا ہے - حالی، شبلی، آزاد اور سرسید کے ہاں تصحیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اردو تحقیق کی روایت پہلی جنگِ عظیم سے شروع ہوتی ہے - ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - ان سے قبل مشرقی علوم میں تحقیق کی روایت بہت کچھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ہاتھوں مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی اور یہی لسانی اور تصحیح متن کی روایت پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں پھلنے پھولنے لگی تھی - اردو ادب کی تحقیق و تدقیق بھی اسی تحقیقی روایت کا حصہ ہے - جن بزرگوں کے نام ابھی اُوپر لیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر کے علمی کارنامے اردو ادب کی حدود سے نکل کر عربی اور فارسی کے ذخیرے تک جاتے ہیں - متنوں کی ترتیب و تصحیح، تاریخ ادب کے غیر معلوم گوشوں کی دریافت، زبان کے آغاز و ارتقاء کی نشان دہی اور شعرا و ادبا کے حالات زندگی کی تعین کے علاوہ ان علوم کی بازیافت اُن لوگوں کا حصہ' خاص ہے جو مسلمانوں کے علوم اور مسلمانوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں - ایشیاٹک سوسائٹی کی روایت کے زیر اثر یہ ادبا فلالوجی کے اصولوں اور زبانوں کی شجرہ بندی کا بہت شوق رکھتے ہیں - اس سے ہٹ کر ادب کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا احساس بھی ان محققین کی تحریروں میں نمایاں ہے - اس سے ہماری

تاریخ ادب کی تدوین کا کام بہت کچھ آسان ہوگیا ہے ۔ لیکن تحقیق کو حقائق کی صحت سے آگے ان کی تاویل و تشریح اور فلسفیانہ توجیہہ تک لے جانے میں ان صاحبوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ۔

اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ آئندہ کے لیے تحقیق اور تنقید الگ الگ خانوں میں بٹ گئی اور اردو ادب میں تنقید ، تحقیق سے ایک بڑی حد تک بے نیاز ہوکر چلنے لگی - اس سلسلے میں انفرادی تلاش و جستجو کے علاوہ دبستانی سطح پر جو کام ہوا ہے ، اس کے بڑے بڑے مرکز حیدرآباد دکن ، اعظم گڑھ اور لاہور قرار دیے جا سکتے ہیں - تحقیقی اصولوں کے استعمال میں ان دبستانوں کے نظریات میں بین فرق ہے - دکنی محققین تصحیح متن میں قلمی نسخوں کے اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نظری مباحث میں بھی واقعات کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر ادبی کتابوں پر رکھتے ہیں اور تاریخ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرتے - تاہم اس سے دکنیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے آ گیا ۔ لسانی لحاظ سے دوسرے دبستانوں پر دکن کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہاں کے محققین زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل میں زبان کو فلالوجی کی حدوں سے نکال کر صوتیات کی منزل میں لے آئے ۔ یہی توانا روایت دوسرے علاقوں کے محققین کو متأثر کیے بغیر نہ رہ سکی ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے لے کر دور حاضر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک یہ صوتیاتی شعور ایک مستقل اور سائنٹفک علم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے - تحقیق کا دوسرا دبستان جس کا مرکز اعظم گڑھ ہے ، اس لحاظ سے دکنی دبستان سے مختلف ہے کہ وہاں اردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس صورت حال کا علمی جائزہ مذہبی رجحانات اور مذہبی علوم کی روشنی میں لیا گیا - علامہ شبلی کی مورخانہ روایت ان لوگوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے - متن کی ترتیب و تصحیح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی - اس کے مقابلے میں اردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا ۔

تیسرا لاہور یا اورینٹیئل کالج لاہور کا دبستان ہے ۔ یہ محققین مختلف علوم کے مطالعے کو زبانوں کے مطالعے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اسی لیے انھوں نے ادب کو معاشرتی علوم کے حوالے سے دیکھنے کی سعی کی ، خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ لوگ بنیادی طور پر محققین ہیں اور ادب سے حاصل کردہ واقعات اور سنین کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ۔ اردو تحقیق کی روایت میں انھوں نے احتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا ۔ تحقیق میں سہل انگاری اور حوالے کی بے احتیاطی کا محاسبہ سختی سے کیا گیا ۔ تحقیقی مسائل میں ان محققین کا کارنامۂ خاص یہ ہے کہ اردو تحقیق کی مخصوص زبان وضع کرنے کے علاوہ ان بزرگوں نے تحقیقی مقالات میں اسلوب کی اہمیت پر بہت زیادہ اصرار کیا اور کھرے کھوٹے کی تمیز میں بے رحمی اور بے لحاظی کے عناصر کو ضروری گردانا ۔ بنیادی اور ثانوی مآخذ کے درمیان امتیاز ، دلائل کی مختلف کڑیوں کی پوری چھان بین ، نسخوں کی قدامت کا تعین ، رسم الخط کے عہد بہ عہد تغیرات کا احساس اور املا کے خصائص کے ادراک کے علاوہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل اس دبستان کی خصوصیات ہیں ۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہ سالے میں ان مذکورہ دبستانوں کے علاوہ رام پور اور پٹنہ کے دبستان بھی ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ پٹنہ کے دبستان میں قاضی عبدالودود ، ڈاکٹر اختر اورینوی ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے علاوہ ایک خاصا بڑا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ان میں قاضی عبدالودود سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کے اصولوں اور قواعد کی پابندی باقی محققین کے ہاں نظر آتی ہے ۔ قاضی صاحب نے ثانوی مآخذ سے بالعموم صرف نظر کیا اور اپنی تحقیق و تدقیق کو معاصر مواد تک محدود کر دیا ۔ حوالے میں احتیاط کا عنصر قاضی صاحب کے ہاں بہت ہے ۔ دبستان لاہور کے مقابلے میں اس دبستان میں ایک کمی البتہ یہ نظر آتی ہے کہ مختصات کے بے دریغ استعمال سے تحریر کی روانی اور اسلوب کا حسن ماند پڑ گیا ہے ۔ معاصر مواد سے مناسب حد تک نتائج اخذ کر کے حوالوں کو اپنی تحریر کا لازمی حصہ بنانے کا طریقہ ترک ہو گیا ہے اور

مواد کو خام صورت میں قارئین تک پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے - ترتیب متن میں البتہ ان محققین نے بہت کام کیا ہے اور متن میں جو معیار پٹنہ کی تصانیف میں ملتا ہے ، وہ لاہور کے دبستان کی تصانیف سے کسی طرح کم نہیں ہے -

رام پور کے دبستان میں مولانا امتیاز علی صاحب عرشی کی ذات گرامی بہت اہمیت رکھتی ہے - عرشی صاحب نے متن کی تصحیح میں جو محنت اٹھائی ہے اس کے قابل قدر نمونے مکاتیب غالب ، سلک گوہر اور دستور الفصاحت ہیں - دستور الفصاحت کی ترتیب اور تحشیے میں تذکروں کی ترتیب کا ایک نیا اسلوب نکالا گیا ہے جس سے حواشی اصل کتاب کے علاوہ معلومات کا ایک بڑا گنجینہ بن گئے ہیں -

(۲)

تقسیم بر صغیر کے بعد اردو تحقیق اور تنقید کا سلسلہ ابتدائی چند برس میں ایک بڑی حد تک منتشر ہو گیا - سیاسی حالات اور آبادی کے نقل مکانی نے پاکستان اور بھارت دونوں جگہ سیاسی اور سماجی سطح پر کئی تبدیلیاں پیدا کیں - تحقیق ایک صبر آزما عمل ہے - اس میں جن سہولتوں اور مواد کے ذخیروں کی ضرورت ہے ، وہ تاریخ کے ایسے دور میں میسر نہ تھی ، جب کہ ایک طرف مہاجرین کی بحالی اور دوسری طرف نوزائیدہ مملکت کی بقا کے مسائل درپیش تھے - ذہنی سکون کے رخصت ہو جانے سے وہ فرصت اور علمی تک و دو میں وہ انہماک باقی نہ رہا جو کسی اعلیٰ پائے کے علمی کام کے لیے ضروری ہے - ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ملک کی سیاسی حالت مسلسل اور متواتر بحران کا شکار رہی - حکومت اعلیٰ پیمانے پر تعلیمی منصوبہ بندی نہ کر پائی - اگرچہ انفرادی طور پر پاکستان میں تحقیق کی روایت کسی نہ کسی طرح زندہ رہی اور حکومت بھی بعض اداروں کی تشکیل اور مالی اعانت کسی نہ کسی حد تک کرتی رہی لیکن اعلیٰ تحقیقی کام کے لیے فضا تیار نہ ہو سکی - آخر کار پہلے پنج سالہ منصوبے میں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور کو حاوی تھا ، مختلف تعلیمی مدارج میں تحقیق کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا - اس

منصوبے کے خالقین نے واشگاف الفاظ میں اس بات کا اقرار کیا کہ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام کی تشکیل نو از حد ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا گیا کہ ہمارے ملک میں ابھی تحقیق کا وہ شعور پیدا نہیں ہوا جو علم اور حصول علم کو انقلاب آفریں بنا سکے۔

پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ بھارت میں اُردو دشمنی کی قوی لہر اور حکومت کی معاندانہ روش کے باوجود اُردو تحقیق میں جس معیار کا کام ہوا ہے، ہمارے علمی سرمائے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سبب شاید یہ ہے، کہ وہاں اردو ادب اور زبان کی خدمت کا جذبہ ایک سرفروشانہ اور مجاہدانہ انہماک کا نتیجہ ہے۔ وہاں اُردو کے محققین و ادبا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اُردو زبان کے بقا و تحفظ کا مسئلہ خود ان کی مرگ و حیات کا مسئلہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہاں علمی سرگرمی کی رو زیادہ موثر اور متحرک ہے۔ دوسرے بھارتی محققین کو علمی ذخائر کی جو سہولتیں میسر ہیں ان کا سامان اس نوزائیدہ مملکت میں فی الحال ممکن ہی نہیں۔ ادبی تحقیق اعلیٰ علمی سرمائے اور عمدہ لائبریریوں کے بغیر مشکل ہے۔ پاکستان میں تحقیق کے میدان میں پس ماندگی کے اسباب میں اس مذکورہ سبب کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہے۔ وہ اپنے وسائل کا ایک اہم حصہ تحقیق و تدقیق کے لیے وقف کر رہی ہے۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں، اعلیٰ تعلیم کے علاوہ تحقیق کے بھی مراکز ہیں، ہر سال کم و بیش ۳۰ لاکھ روپے کی مالی امداد صرف تحقیقی و سائنس پر صرف ہو رہی ہے اور اس رقم کا ایک حصہ اُن منصوبوں کے لیے وقف ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں اردو زبان و ادب کے لیے حکومت ہر سال کم و بیش سولہ لاکھ روپے مختلف اداروں کی تحویل میں دیتی ہے۔ اس سے ہمارے ہاں تحقیقی کام کی اہمیت کا کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۳)

اس مرحلے پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی اس امداد کے باوجود آخر ہمارے ہاں تحقیق کا معیار کیوں بلند نہیں ہو رہا؟ اس کے کچھ بنیادی اسباب ہیں۔

پاکستان ایسا زرعی ملک ہے جو زرعی مدارج سے ترقی کرتے ہوئے صنعتی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ نوزائیدہ مملکت کی حیثیت سے بھی اسے کئی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں تو اسے اپنی بقا کے لیے اپنے تمام ملکی و ملی وسائل کو بروئے کار لانا پڑا۔ ایسے معاشرے میں جہاں اپنی بقا کا مسئلہ دیگر مسائل پر فوقیت رکھتا ہو اور قوم کا ہر فرد مادی اور منفعت بخش پیشوں کی تلاش میں سرگرداں ہو، جہاں قومی فلاح و بہبود کے تقاضے صنعتی اور مشینی معاملات پر منحصر ہو جائیں، وہاں آن ادبی مشاغل کی اہمیت برقرار نہیں رہ سکتی جو فوری طور پر سرمایہ کاری اور دولت اندوزی کا ذریعہ نہ ہوں۔ نئے صنعتی دور کے زیر اثر وجود میں آنے والا نیا طبقہ علوم و فنون کے تفریحی پہلوؤں کا محافظ تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے سنجیدہ تحقیقی معاملات اور تہذیبی اور علمی سرمائے کی حفاظت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کی بیش از بیش توجہ اور تحقیق کے لیے رقوم کی فراہمی کے باوجود مادی ترقی کی دوڑ میں وہی علوم و فنون پنپ سکتے ہیں جن سے کاروباری اور تجارتی مفادات وابستہ ہوسکیں، اور ظاہر ہے تحقیق ادب ان افادی پہلوؤں سے ایک بڑی حد تک خالی ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا علمی سرمایہ بھارت کی لائبریریوں میں رہ گیا۔ انڈیا آفس کی کتابوں کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ تشکیل پاکستان کے وقت لے دے کر ہمارے پاس ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی لائبریریوں کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پشاور آرکائیوز اور لاہور کا ریکارڈ آفس تھے۔ حکومت نے نئی نئی یونیورسٹیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں کتاب خانوں کی داغ بیل بھی ڈالی۔ پھر کراچی کا قومی عجائب گھر ہمارے تہذیبی ورثے کا ایک اہم مرکز ہوا جس کی لائبریری آج اپنے مخطوطات کے سرمائے کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے دوش بدوش پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی امداد سے قائم ہونے والے ادارے اور اکیڈمیاں بھی کتابوں کی جمع آوری میں مصروف ہیں؛ لیکن ہمارا یہ علمی سرمایہ فی‌الحال آن ذخائر کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بھارت اور انگلستان میں پڑے ہیں۔ محققین کو پاکستان میں موجود کتب خانوں سے استفادے کے پورے وسائل بھی میسر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ سرمایہ ہی قلیل ہے، دوسرے مختلف اداروں میں باہمی تعاون کی کمی کے سبب

کتابوں سے استفادہ بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ پائے کی تحقیق کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں مواد کی فراہمی، فرصت، اطمینان اور مناسب مالی حوصلہ افزائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک نوزائیدہ مملکت میں، جہاں قوم کا ہر فرد جلب منفعت کی دوڑ میں مصروف ہو، آس فرصت اور اطمینان قلب کا میسر آنا ممکن نہیں جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ پھر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ صنعتی ترقی کے بخار میں مبتلا معاشرہ، علمی کاموں کو بھی کاروباری پیمانوں سے جانچتا ہے۔ تحقیقی کام کی رفتار کا اندازہ بھی مشینی ترازو میں کیا جائے تو پھر تحقیق میں معیار کا مسئلہ کڈھب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رجحان عام ہے کہ ہم ہر تحقیق کا نتیجہ فوری طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شکر کے کارخانے جس طرح اپنی پیداوار (Production) کا عملی ثبوت مہیا کرتے ہیں اور ہر سال جنس کے انبار لگا کر اپنی افادیت ثابت کرتے ہیں، اسی طرح تحقیق ادب میں بھی ہم 'معیار کے مقابلے میں مقدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ادنیٰ سی مثال آردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تاریخ ادبیات اور اردو لغت جیسے عظیم منصوبے ہیں۔ ان اہم منصوبوں میں بھی ہم فوری نتیجے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تحقیق الہ دین کا چراغ نہیں کہ اسے گھسا کر فوراً مطلب کی چیز برآمد کر لی جائے۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہے کہ مختلف علمی اداروں کو اپنی بچاؤ کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بصورت دیگر وہ اپنے علمی کام پر صرف کرتے۔ دوسرے اپنے مال کو "بازار میں لا کر" دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش میں محققین "کاتا اور لے دوڑی" پر عمل کر کے تحقیق کے معیار کو پست سے پست تر کر بیٹھتے ہیں۔ جو محققین اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دیتے اور معیار کے پیچھے جاتے ہیں ان کے لیے علمی کام کے راستے مسدود ہونے کے امکانات بڑھتے ہیں۔ تحقیق سے رفتہ رفتہ جاں کاوی اور محنت کا عنصر خارج ہونے لگا ہے اور یہ کوئی خوش آیند بات نہیں ہے۔

(۴)

صنعت کاری کی عمومی رو نے جہاں دوسرے ممالک میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کی ہے، وہاں پاکستان بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔

اقدار کی شکست کا یہ عمل شعر و ادب کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا ۔ محنت سے جی چراتے ہوئے ، آسان راستوں کی تلاش ہمارے تحقیقی و ادبی کارناموں میں واضح نقش چھوڑ رہی ہے ۔ اس سہل انگاری کے کئی مظاہر ہیں :

(الف) حوالوں میں جعل سازی ، یعنی متاخر کتب سے مواد لے کر معاصر کتب کا حوالہ درج کرنے کی رسم ۔

(ب) حوالوں کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی ۔

(ج) دوسروں کے کیے ہوئے علمی کام کو معمولی رد و بدل سے (بغیر حوالے کے) اپنے ہاں سمو لینے کا رواج ۔

(د) کتابیات کی ترتیب میں سائنٹفک طریق کار سے غفلت ۔

(ہ) متن کی تصحیح میں عدم احتیاط ، غیر معیاری نسخوں کو بنیادی نسخے قرار دینے کی غلطی ، اختلاف نسخ کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی ، پورے علمی ذخیرے کو سامنے رکھ کر کام شروع کرنے کی بجائے ناقص ذرائع پر بھروسہ ، چھپائی اور پروف ریڈنگ میں غفلت ۔

(۵)

ان خامیوں کے علاوہ اخلاقی قدروں سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے بعض غلط رجحان بھی ہمارے ہاں فروغ پا رہے ہیں ۔ ان میں دو کا ذکر ضروری ہے :

اول یہ کہ پاک و ہند کے مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں ۔ دس دس جگہ ایک ہی موضوع پہ کام ہو رہا ہے ۔ محقق ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش میں ناقص اور ادھورا کام چھاپ کر مارکیٹ میں لانا یا پھر ٹائپ کر کے ڈگری کے لیے پیش کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے ۔

پاک و ہند میں تحقیقی کام کرنے والے گنے چنے لوگ ہیں ۔ اگر وہ بھی یہ غیر علمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف چند موضوعات

میں محصور کر لیں تو پھر تاریخ ادب کے غیر واضح گوشے اور مبہم حصے تحقیق کے محتاج ہی رہ جائیں گے ۔ اس میں کچھ برائی نہیں کہ جس موضوع پر معیاری کام نہیں ہوا ، اُس پر کوئی دوسرا محقق قلم اُٹھا کر مواد کا اضافہ اور ناویل و توضیح کے بہتر نمونے پیش کرے اور اپنے پیش رو کی غلطیوں کی نشان دہی کر دے ۔ یہ طریق کار بہت ضروری بھی ہے ؛ لیکن بعد میں شائع ہونے والے تحقیقی کام میں اگر پیش رو کے مقالے کی خامیاں اسی طرح برقرار رہیں یا ان میں دس بیس کا اضافہ ہی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے موضوع کو چھینا جھپٹی کا یہ عمل کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے ۔

دوم یہ کہ مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں اپنے ہاں ہونے والے تحقیقی کام کی مناسب رہنمائی اور باقاعدہ چھان بین نہیں کرتے ۔ نو عمر محقق جلد سے جلد ڈگری حاصل کرنے کی آرزو میں اور فوری طور پر مصنف بن جانے کی تمنا میں کام پر مناسب توجہ نہیں کرتے ۔ ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ پیش روں کے مال پر ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے ۔

صورت حال کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرشار پر اس وقت آگرہ یونیورسٹی ، الہ آباد یونیورسٹی ، لکھنؤ یونیورسٹی ، پنجاب یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں مقالے لکھے جا رہے ہیں ۔ پریم چند پر پنجاب ، علی گڑھ اور سری نگر میں بیک وقت کام ہوا اور ڈگریاں بھی مل چکی ہیں ۔ طنز و مزاح پر پنجاب کے بعد لکھنؤ اور بمبئی میں تحقیقی کام ہوا ۔ رسوا پر علی گڑھ ، بمبئی اور پنجاب میں ڈگریاں دی گئیں ۔ اردو ادب کے سیاسی اور سماجی پہلو پر پنجاب اور سندھ میں ۔ قائم پر علی گڑھ اور کراچی میں کام ہو رہا ہے ۔ آزاد پر پنجاب سے اور اس کے بعد کراچی سے کام ہوا ہے ۔ میر حسن پر پنجاب سے کام ہوا اور چھپ گیا ، اب کراچی یونیورسٹی اور پٹنہ میں بھی جاری ہے ۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ادارے بھی اس دوڑ میں مصروف ہیں ۔ گلشن ہند از حیدر بخش حیدری کے متن کی اشاعت ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے اپنے ذمے لی ۔ آرزو کا متن آ چکا ہے اور دوسرے ابھی مصروف ہیں ۔ "کربل کتھا" پر ڈاکٹر آرزو نے کام شروع کیا ، اس کی خبر اہل دہلی کو بھی ہو گئی ۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کا متن فوراً چھپ

گیا ، پھر مالک رام اور آرزو نے بھی اپنا متن شائع کر دیا ۔ مصحفی کے کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں نثار احمد فاروقی اور نورالحسن نقوی کے درمیان دوڑ جاری ہے ۔ نقوی نے دیوان مصحفی کی جلد اول دلی سے شائع کی ، فاروقی جلد دوم چھاپ کر مارکیٹ میں لے آئے ۔ مصحفی کے آٹھ دیوان ہیں ، دیکھیے یہ معرکہ کب تک جاری رہتا ہے ۔ لاہور سے دیوان زادے کا انتخاب چھپا اور فاضل مرتب پورا دیوان زادہ مرتب کر رہے تھے کہ یہی سلسلہ رام پور سے شروع ہو گیا ۔ اب دونوں دیوان زادے گھوڑ دوڑ کے میدان میں آتر چکے ہیں ۔

علمی و ادبی معاملات میں اس طرح کی تنگ نظری کسی اچھے معیار کا پیش خیمہ نہیں ہو سکتی ۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اب تک کی باہمی آویزش سے جو سرمایۂ علمی سامنے آیا ، اس کا زیادہ حصہ ناقص اور بیہودہ ہے ، کیوں کہ بعض محققین گوے سبقت لے جانے کی تگ و دو میں موضوع سے انصاف نہیں کر پاتے اور بعض نے دوسروں کی محنت کو بغیر حوالے کے اپنے ہاں سمو کر اخلاقی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ۔ اردو تحقیق کے لیے یہ صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے ۔

(٦)

ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اور رجحان بھی تحقیق کے لیے آزمائش کا حکم رکھتا ہے ، اردو میں تحقیق کی روایت پہلی جنگِ عظیم کے بعد تنقید سے الگ ہو گئی ۔ ابتدائی محققوں نے حقائق کی جمع آوری اور واقعات کی صحت کا خیال تو رکھا لیکن حقائق کی تعبیر و تاویل اور فلسفیانہ توجیہہ سے دامن کش رہے ۔ تاریخ ادب کے لیے وہ خام مواد مہیا کر کے مطمئن ہو گئے اور ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور سے کناوہ کش رہے ۔ نقادوں نے تحقیق کو تنقید کے مقابلے میں گھٹیا ذہنی عمل گردانا اور تحقیق و تنقید کے فاصلے بڑھتے چلے گئے ۔ تقسیم بر صغیر کے بعد تنقید کو تحقیق کا دشمن قرار دے کر نقادوں نے پُر حقارت رویہ اپنا لیا ۔ اس مغایرت اور نفرت آمیز رویے نے تحقیق کے لیے تنقید کی اور تنقید کے لیے تحقیق کی ضرورت کا ادراک نہ ہونے دیا ۔ محقق گلی سڑی ہڈیوں کے تاجر قرار پائے اور ساجی

مرتبے کے سنگھاسن پر صرف تنقید کو جگہ ملی - اسی افراتفری نے اردو ادب کے بعض اہم محقق کھو دیے - بعض نے تحقیق سے توبہ کر کے تنقید کو اپنا لیا کیوں کہ تنقید کی مارکیٹ زیادہ بلند سماجی مرتبے کی ضامن تھی -

گزشتہ بیس برس کے تحقیقی سرمائے کو نظر غایر سے دیکھا جائے تو اس میں سست روی کے باوجود ایک حصہ ایسا ضرور ہے جسے قابل اعتنا قرار دیا جا سکتا ہے - حکومت کی طرف سے تحقیق کے معیار کو بلند کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی کوششیں برابر جاری ہیں - پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بعض ادارے قائم کیے گئے - ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک کئی نئے ادارے اور نئے منصوبے اس میں شامل کیے گئے - انجمن ترق اردو کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اقبال اکیڈمی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سندھی ادبی بورڈ، ترق اردو بورڈ کراچی (= اردو ڈکشنری بورڈ)، اردو اکیڈمی بہاولپور، اردو اکیڈمی لاہور، مرکزی اردو بورڈ لاہور (= اردو سائنس بورڈ)، بزم ثقافت لاہور، بزم اقبال لاہور، مجلس ترق ادب لاہور، پنجابی اکیڈمی لاہور، پشتو اکیڈمی پشاور وہ چند ادارے ہیں جو مختلف مرحلوں میں حکومت کی مالی مدد سے ادب و فن کی خدمت کر رہے ہیں - ان میں بیشتر نے اپنی توجہ اردو تحقیق پر صرف کی - جتنا تحقیقی سرمایہ اس سرکاری مدد سے میسر ہوا ہے، قابل لحاظ ہے - ظاہر ہے کہ سب لکھنے والوں کا تحقیقی معیار ایک جیسا نہیں ہو سکتا اور معاشرے کے عام رجحانات سے محققوں کا دامن بچانا بھی ممکن نہیں - میرا خیال یہ ہے کہ اگر مختلف ادارے باہمی تعاون اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت اپنی تحقیقی حدود مقرر کر لیں تو ہمارے ہاں انفرادی سرمائے اور مالی سرمایے دونوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے - موجودہ صورت میں ان اداروں نے جو کچھ کیا ہے، اس کی رفتار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک مذکورہ بالا اداروں میں سے بعض وجود میں نہیں آئے تھے اور جو موجود تھے، ان کی پالیسی واضح نہ تھی، اس لیے اس دور میں کام کی رفتار بہت سست تھی - ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک ان اداروں کی کارگزاری کی رفتار اور کام کی مقدار میں خاصا

اضافہ ہوا - ان دس برس میں تحقیق کی سہولتوں کے بڑھ جانے اور مالی امداد کے اضافے سے ہمارا علمی سرمایہ بعض اعلیٰ درجے کی تحقیقی تصانیف سے مالا مال ہوا - اگر ہم مختلف اداروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ہمیں اعلیٰ پائے کی تحقیقی تصانیف کا کچھ نہ کچھ سرمایہ مل جاتا ہے - انجمن ترقی اردو کے اہم منصوبوں میں سے قاموس الکتب کا منصوبہ بہت اہم ہے - اس کی پہلی جلد ، جو اردو میں مذہبی کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے ، بعض جزوی امور سے قطع نظر ، اردو کے علمی سرمائے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے - فہرست مخطوطات اردو کی جلد اول بھی انجمن کے علمی کام کا بہت اچھا نمونہ ہے - اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو نے جو متن تصحیح کے بعد شائع کیے ، ان میں پھول بن ، سن لگن اور گلشن عشق کو امتیازی حیثیت حاصل ہے - چند مقالات کے مجموعے اور مونوگراف بھی انجمن کے علمی کام کا اچھا نمونہ ہیں - شمالی ہند کی نثری داستانیں ، اردو تھیٹر ، غالب فکر و فن ، سرشار کی ناول نگاری ، کاروان صحافت اور قدیم اردو ، انجمن کے معیار کی ضمانت ہیں - اسی طرح اقبال اکیڈمی کی تصانیف میں اقبال کی غیر مدون تحریروں کے مجموعے اور تذکرۂ شعرائے کشمیر قابل قدر ہے - مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ہمارے تعلیمی نظام کے متعلق بعض کتابیں شائع کر کے اردو کی علمی حیثیت کو مستحکم کیا ہے - سندھی ادبی بورڈ نے صوبۂ سندھ کے علاقے میں فارسی اور سندھی سرمائے کے علاوہ کچھ کچھ اردو کی طرف بھی نگاہ التفات کی - ترقی اردو بورڈ نے متن شائع کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیا لیکن اس میدان میں باغ و بہار کے سوا وہ کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے پائے - اردو لغت کی اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے اور اب تک جو اجزا چھپ کر سامنے آئے ہیں ، ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو میں لغت کی ضرورت کو یہ ادارہ بخوبی پورا کر رہا ہے - اردو اکیڈمی بہاولپور کی کتابوں میں طبی لغت اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کا تحقیقی مقالہ خاصے کی چیزیں ہیں - اردو اکیڈمی لاہور نے درسی ضروریات کے علاوہ اردو کی قاموس شائع کر کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا - مرکزی اردو بورڈ لاہور نے سائنسی کتابوں کے علاوہ اردو کو باثروت بنانے کے لیے تراجم کا سلسلہ بھی شروع کیا - اس لحاظ سے ان کی شائع کردہ کتابوں میں "بلوغ الارب" اور "الاخبار الطوال" تحقیقی

اور علمی لحاظ سے اس ادارے کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں ۔ پنجابی ادبی اکیڈمی نے تحقیقات چشتی اور بعض دوسری کتابیں شائع کر کے اردو ادب کو فائدہ پہنچایا ۔ پشتو اکیڈمی نے پشتو ادب کے علاوہ اردو اور پشتو کے تعلق پر ایک کتاب شائع کر کے اردو کے لسانی جائزے میں ایک نئی منزل کا سراغ لگایا ۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی اپنی بساط کے مطابق اردو ادب کی خدمت کی ۔ مجلس ترقی ادب کے دائرۂ کار میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اہم ہے ۔ ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو شائع کرنے میں خاصی محنت اٹھائی ہے ۔ اس کے علاوہ تذکروں اور مصنفین پر کتابوں کے منصوبے بھی چل رہے ہیں ۔

(۷)

سرکاری اعانت میں چلنے والے اداروں کے علاوہ بعض ناشروں نے بھی اردو ادب کی طرف توجہ کی ۔ گلشن بے خار کے دو ترجمے شائع ہوئے ، خطوط غالب چھپی ، حالی کا ذہنی ارتقا ، انتخاب شاہ حاتم ، ہفت گلشن ، داغ ناشرین کی مساعی کا نتیجہ ہیں ۔ چند ایک اور کتابیں بھی ناشرین کی کوششوں سے شائع ہوئیں ۔

تحقیق کا ایک اور مستقل حلقہ پاکستان کی یونیورسٹیاں ہیں ۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام خاصی مقدار میں ہوا ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی ، کراچی یونیورسٹی ، سندھ یونیورسٹی ، پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی میں تحقیق کا کام برابر ہو رہا ہے ۔ بعض یونیورسٹیوں میں ایم اے کی سطح پر اردو کے مقالے بکثرت لکھے گئے ۔ پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی کے سوا پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے بھی شائع ہوئے ۔

(۸)

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام محتاج تعارف نہیں ۔ تشکیل پاکستان کے بعد جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے ، ان سب نے تحقیق پر زور دیا ۔ قومی تعلیمی کمیشن کے قیام سے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت کا

احساس بڑھ گیا ۔ کمیشن کی رپورٹ میں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کی اہمیت کو بُر زور الفاظ میں بیان کیا گیا ۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ یونیورسٹی میں تحقیق کو اہم مقام دیا جائے ، کیوں کہ تحقیق ایک استاد کو مستعد ، متحرک ، فعال اور جدید معلومات سے باخبر رکھنے کا وسیلہ ہے ۔ چنانچہ سفارش کی گئی کہ ہر یونیورسٹی اپنے ہاں تحقیقی سہولتیں مہیا کرے اور تحقیقی شعبوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے استادوں کی (تحقیقی کام کی بنیاد پر) مناسب حوصلہ افزائی کرے ۔ کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر اگرچہ عمل نہیں کیا جا سکا لیکن اس سے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام میں سرگرمی پیدا ہوئی ۔ گزشتہ دس سال (یعنی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء) میں یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت پر خاصا اصرار کیا گیا ہے ۔ مختلف یونیورسٹیاں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کے علمی کام پر خصوصی توجہ کر رہی ہیں ۔

(۹)

گزشتہ دس برس کے تحقیقی کام بغور دیکھا جائے تو چار اہم رجحان نظر آتے ہیں اور گمان غالب ہے کہ مستقبل میں تحقیقی کام انھی مرکزی نکات سے متعلق ہوگا :

(الف) قدیم ادبی سرمائے کی بازیافت اور متن کی مناسب تصحیح ۔

(ب) پاکستان کے قدیم اردو ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی مناسب اشاعت ۔

(ج) اردو زبان کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق ۔

(د) تدوین لغت اور اصطلاحات سازی کی اہمیت ۔

یہ رجحانات ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور آگے چل کر ان سے تحقیق کی ایک منظم اور مربوط روایت کی داغ بیل کی توقع ہے ۔ امید ہے آئندہ چل کر پاکستانی شعور اور پاکستانیوں کے عزائم کی جھلک تحقیقی میدان میں بھی نظر آئے گی ۔

پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ

(۱)

پنجاب یونیورسٹی میں مشرق علوم کے تحقیقی سرمائے میں پی ایچ ڈی کے مقالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے - عربی ، فارسی ، اسلامیات ، اردو اور پنجابی ، سنسکرت اور ہندی کے مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالات کا ایک بیش قیمت سرمایہ موجود ہے - مشرق علوم کو اس دانش گاہ میں مدت تک امتیاز حاصل رہا ہے - ڈاکٹر لائٹنر ، ڈاکٹر لکشمن سروپ ، ڈاکٹر آرنلڈ ، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ، پروفیسر عبدالعزیز میمنی ، حافظ محمود شیرانی ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور پروفیسر وولز کی شخصیتیں محتاج تعارف نہیں - ان فضلا کی نگرانی میں تحقیق و تدقیق اور تدوین متون کی جو روایت قائم ہوئی اس کی بنا پر مشرق علوم و ادبیات میں خاص طور پر اعلیٰ درجے کے مقالات لکھے گئے اور بعض متنوں کی تصحیح و ترتیب کا معیاری کام بھی ہوتا رہا - اس مادر علمی کے کئی نامور فرزندوں کے مقالات شائع ہوکر محققین و ماہرین سے داد وصول کر چکے ہیں - شائع شدہ تحقیقی مقالات میں اردو کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق کا تحقیقی مقالہ بعنوان "محمد حسین آزاد" اور فارسی کے بارے ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" ان چند مقالات میں سے ہیں جن کی اشاعت کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی سرمائے کی دھاک بیٹھ گئی - شائع شدہ مقالات کی تعداد کم رہی اور اس میں بیشتر حصہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اشاعت کی نوبت نہیں آ سکی -

مشرق علوم اور ادبیات کے اس اہم تحقیقی ذخیرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - ایک حصہ تو بعض قدیم متنوں کی ترتیب اور تحشیے کا ہے ، دوسرا اور تیسرا حصہ در اصل تحقیق کے طریق کار کی بنا پر

الگ الگ شمار کیا جا سکتا ہے ۔ یونیورسٹی کے تحقیقی قواعد کے مطابق دو قسم کی تحقیق ممکن ہے ۔ ایک یہ کہ محقق واقعاتی اور تاریخی حوالے سے کوئی نیا مواد دریافت کرے اور مقالے کی بنیاد پر اس پر رکھے ، دوسرا یہ کہ پہلے سے معلوم اور موجود مواد کی بنا پر سابقہ مواد کی کوئی نئی تعبیر یا تشریح پیش کرے ۔ پہلی قسم میں محقق زیادہ تر واقعات اور سنین کے اندراج کی کوشش کرتا ہے اور اس کا رویہ واقعاتی (Factual) ہوتا ہے ۔ دوسرے وہ محقق سے زیادہ نقاد کا فریضہ بروئے کار آتا ہے اور پہلے سے موجود حقائق کی تنقیدی اور تجزیاتی تعبیر و تشریح کرتا ہے ۔ اس ذخیرۂ علم میں آج جس مقالے کے مطالب سے بحث کی جائے گی ۔ اس کا تعلق اردو ادب سے ہے ۔

گذشتہ چند برس میں جو مقالے اردو میں لکھے جا رہے ہیں ان کا غالب رجحان تحقیق سے زیادہ تنقید کی طرف ہے ۔ تحقیق اور تنقید لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسرا نامکمل اور ناقص رہتا ہے ۔ اردو کے تحقیقی مقالات کا یہ پہلو خوش آئند بھی ہے اور افسوس ناک بھی ۔ خوش آئند اس لحاظ سے کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے لکھے گئے مقالات میں مواد کی چھان پھٹک کے ساتھ ان کی تجزیاتی قدر و قیمت بھی پیش نظر رہتی ہے اور تحقیق محض گورکنی نہیں رہتی اور افسوس ناک اس اعتبار سے کہ ایسے اکثر مقالات کا معیار کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں اور محقق ندرت فکر اور تخیل کی اڑانوں میں گرفتار ہوکر واقعات کی صحت کی طرف زیادہ اعتنا نہیں کرتے ۔ نتیجتاً ان کے تنقیدی نتائج پا در ہوا مفروضوں پر مبنی رہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اردو کے مقالات میں اس حصہ خاص میں مجھے صرف تین مقالے ایسے ملے جن میں تنقیدی تجزیے کو حقائق کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے ۔ ۱۹۸۰ء تک ڈاکٹر رضیہ نور محمد کا مقالہ ''اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مقالہ ''اکبر الہ آبادی'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ ''نفسیاتی دبستان'' میرے نزدیک اردو کے سرمایۂ علم میں اہم اضافہ ہیں[۱] ۔ ان میں سے آج ڈاکٹر رضیہ

---

۱ ۔ اب یہ تینوں مقالے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ۔

نور محمد کے مقالے کا تعارف پیش کیا جاتا ہے ۔

(۲)

ڈاکٹر رضیہ نور محمد ، ٹریننگ کالج برائے خواتین کی پرنسپل رہیں ۔ انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز بمبئی میں کیا تھا ۔ پھر پرائیویٹ طور پر ایم ۔ اے فارسی تک تعلیم کی تکمیل پنجاب میں کی ۔ مشہور محقق پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم سے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ سے تدریسی کام کا آغاز کیا ۔ انگریزی ادبیات میں تعلیم کی اعلیٰ اسناد حاصل کر کے کوئین میری کالج ، ہوم اکنامکس کالج ، لاہور کالج برائے خواتین ، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے بعد موجودہ منصب پر آئی ہیں[1] ۔ انھوں نے پروفیسر شجاع الدین مرحوم کے ذوقِ تاریخ اور شغف ادبیات فارسی سے استفادہ کیا جس سے ان کا حقائق کی چھان پھٹک کا انہاک اجاگر ہوا ۔ ان کے اپنے ذوق کا پتہ افسانہ نگاری سے ملتا ہے ۔ چنانچہ اوائل میں ان کے کئی افسانے رسالہ ادب لطیف میں جو ان دنوں مرزا ادیب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا شریک اشاعت ہوئے ۔ انھیں اپنے پنجابی ناول پر گلڈ کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے ۔ ان کے ہر دو رجحانات یعنی تحقیق اور تنقید کی آمیزش سے یہ تحقیقی مقالہ خاصے کام کی چیز ہو گیا ہے ۔

(۳)

"اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی خدمات" میں صحتِ واقعات کا اہتمام ہے اور ساتھ ہی تجزیاتی طریق کار کی مدد سے مستشرقین کے کارناموں کا ادبی ، تدریسی اور علمی مرتبہ تعین کیا گیا ہے ۔ انھوں نے تنقید کو ٹھوس حقائق پر استوار کیا ہے اور مستشرقین کے کارناموں کے پس پشت محرکات کی تلاش و جستجو کی ہے اور مختلف ادوار کا سماجی اور اقتصادی عوامل کے پس منظر میں تجزیہ کیا ہے ۔ اس لحاظ سے ان کی تنقید کا مسلک سماجی حوالوں سے متعین ہوتا ہے ۔

۱ ۔ ریٹائرمنٹ کے کچھ ہی دنوں بعد پچھلے سال (۱۹۸۷ء) ان کا انتقال ہوا ۔

یہ مقالہ ۵۲۹ ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں مستشرقین کی خدمات کو اہلِ یورپ کی آمد یعنی ۱۴۹۸ء سے شروع کیا گیا ہے اور یہ داستان ۱۹۴۷ء پر ختم کی گئی ہے ۔ اس طرح مقالے کا کینوس ساڑھے چار سو سال پر پھیلا ہوا ہے ۔ ظاہر ہے اتنے طویل دور میں ہر مستشرق کی علمی خدمات کا مفصل جائزہ ممکن نہیں ۔ انھوں نے صرف چند اہم مصنفین کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور باقی افراد کا مجمل تذکرہ ہوا ۔ اس میں بھی زیادہ توجہ انھوں نے ادوار کے تجزیے اور مستشرقین کے رجحانات و میلانات کی شناخت پر کی ہے ۔ مستشرقین کے ذخیرۂ تحریر کو مربوط طور پر ابھی تک دیکھنے کی سعی نہیں کی تھی ۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے پہلی بار ادوار کی خصوصیات کا تعین کیا ہے اور اس کے پس پردہ عوامل کا سراغ لگایا ہے جس سے اردو ادبی تاریخ کی بعض غلط فہمیوں کی تصحیح بخوبی ہوگئی ہے اور بعض اوجھل گوشے بھی سامنے آ گئے ہیں ۔

(۴)

اردو ادب کا طالب علم ادبی تاریخ کو عموماً شمالی ہند سے بیان کرنے کا عادی ہے اور اس میں فورٹ ولیم کا تذکرہ محض ایک محدود جزیرے کے طور پر کرتا ہے ۔ مشرق اور جنوب کی ادبی تحریکات کا شمالی علاقوں سے کیا رشتہ تھا ؟ دکنی ادب سے ہماری تاریخ سیدھی شمال میں آ کر برصغیر کے دوسرے گوشوں کو نظر انداز کرنے کی قائل ہے ۔ اسی طرح دکن میں نثر کی مربوط تاریخ کے بعد فورٹ ولیم کالج اور پھر یک لخت ۱۸۵۷ء تک آ نکلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں نثر کی کوئی مربوط تاریخ بنتی نظر نہیں آتی ۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے اپنے مقالے میں ان گم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا ہے اور بتایا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر درسی ضرورت کے تحت لکھی گئی اور اس کا بنیادی رشتہ مذہبی اسالیب سے نہیں بلکہ اردو اور فارسی اسالیب کے ان پیمانوں سے ہے جو نثر سادہ کے روپ میں یہاں رائج تھے ۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خود فورٹ ولیم کالج میں اعلیٰ جماعتوں میں رنگیں بیانی اور صنائع بدائع اور تشبیہ و استعارے کا زور ہے اور یہی اس زمانے میں مقبول تھے ۔ انھوں نے فورٹ ولیم کالج اور شمالی ہند کی نثر کے درمیانی خلا کو بائبل کے اردو تراجم سے پورا کیا ہے اور بتایا

ہے کہ کس طرح بول چال کی زبان اور محاوروں کو بائبل کے تراجم میں استعمال کیا گیا ۔ اس کی نشان دہی بھی کی گئی کہ ہر چند برس کے بعد تراجم پر نظرثانی ہوئی اور زندہ اور بول چال کی زبان کو ہر بار بائبل میں برتا گیا ۔ اس سے اردو نثر سادہ کی تاریخ نہ صرف یہ کہ ایک نئے اسلوب سے آشنا ہوئی بلکہ اس کے تسلسل اور تواتر کا پتہ بھی چل گیا ۔ فورٹ ولیم کالج کے بارے میں اس غلط فہمی کو بھی انھوں نے حقائق کی مدد سے دور کیا ہے کہ یہ مستشرقین سیاسی مصلحتوں سے بالا تھے ۔ فورٹ ولیم کالج ، سی ایس ایس اکیڈمی قسم کی چیز تھا جس میں زبانوں کا شعبہ محض ایک محدود اور غیر موثر ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ کہ اس کے اثر و نفوذ کی داستان مبالغہ آمیز ہے ۔ فورٹ ولیم کالج اور انگلستان کے ہیلی بری کالج کے بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویے کو بھی انھوں نے وضاحت سے بیان کیا ہے اور بتایا کہ فورٹ ولیم کالج کے مستشرقین اردو کے لسانیاتی پہلوؤں کو ہند آریائی حوالوں سے دیکھنے کے عادی تھے ۔ ضمناً انھوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی سنسکرت پسندی کا بھی تجزیہ کیا اور ولیم جونز کی خدمات کو صحیح تناظر میں پیش کیا ۔ اس ضمن میں انھوں نے برطانوی اقتدار، پادریوں کی اردو دانی اور مستشرقین اور مغرب پرستوں کی آویزشوں کو بھی بیان کیا اور اردو ادب پر اس کا کیا اثر پڑا اس کی وضاحت بھی کی ۔ انھوں نے بتایا ہے کہ برطانوی حکومت اول اول اپنی رعایا کو پدرانہ شفقت کے اصول سے دیکھتی رہی پھر پالیسی میں تبدیلی آئی اور سول سروس کے افسروں نے یہاں کے رسم و رواج اور زبانوں کے بارے میں اپنی پالیسی بدل دی ، تیسرا دور وہ ہے جب مستشرقین کو تعلیمی نظام میں شکست اور مغرب نوازوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور مقامی زبانوں کا مطالعہ مستشرقین کے لیے محض ایک اکیڈمک سرگرمی بن کر رہ گیا ۔

(۵)

مقالہ دس ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب پس منظر کے عنوان سے ہے ، جس میں اردو زبان کے خمیر میں غیر زبانوں کے الفاظ خصوصاً پرتگالی الفاظ کی تفصیل دی گئی ہے ۔ اصل مقالہ دوسرے باب سے شروع ہوتا ہے

جس کا عنوان ہے "اہل یورپ کی آمد اور اردو زبان و ادب کی حالت ۱۷۵۶ء تک" ، اس باب میں اس بنیادی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں اردو کے بارے میں گرامر کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں لاطینی گرامر کو نمونہ بنایا گیا نیز اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اردو کے بارے میں لکھنے والوں میں اس زمانے میں بھی پرتگالی ، فرانسیسی ، ولندیزی اور جرمن تھے ، انگریزی مستشرق اکا دکا ہی ملتے ہیں ۔ کلائیو کی آمد کے بعد سے انگریز مستشرقین ملنے لگے ہیں ۔ تیسرے باب میں مستشرقین کی خدمات کو ۱۸۰۰ء تک پیش نظر رکھا گیا ہے اور بتایا کہ وہ کون سے مذہبی سیاسی اور سماجی محرکات تھے جن کی بنا پر انگریز مستشرقین نے مقامی زبانوں کی طرف توجہ کی اور کس ضرورت کے تحت فورٹ ولیم کالج قائم ہوا ۔ اردو سے زیادہ ہندی اور ہندی سے زیادہ سنسکرت اور عربی فارسی کی طرف کیوں زیادہ توجہ کی گئی ۔ چوتھے باب میں فورٹ ولیم کالج کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس مقالے کا سب سے اہم حصہ یہی ہے ۔ پانچویں باب میں دیگر مصنفین و محققین کو لیا گیا ہے ، خصوصاً عیسائی مشنریوں نے لغت اور گرامر اور تراجم میں جو خدمات انجام دیں ان کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ باب ششم میں ۱۸۲۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کے مراحل بیان ہوئے ہیں اور انگریزیت پسندی کی یلغار کے عقب میں بعض عوامل کو دیکھا گیا ہے ۔ ایک باب گارسیں دتاسی کے لیے مخصوص ہے ۔ پھر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک مستشرقین کی علمی کامیابیوں کو بیان کیا ہے اور یورپ میں مستشرقین نے کیا کیا کارنامے انجام دیے ان کی وضاحت کی ہے ؛ لیکن یہاں بھی زیادہ توجہ برصغیر پر مرکوز ہے ۔ اس زمانے میں مقامی زبانوں کی تحقیق کا مقصد سماجی حالات سے آگاہی تک رہ گیا تھا ۔ ایک باب پنجاب میں مستشرقین کی اردو خدمات کے لیے وقف ہے ۔ آخری باب کا موضوع ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کا جائزہ ہے جب بعض مستشرقین نے ذاتی شوق سے اور بعض نے فوجیوں کو اردو سکھانے کے لیے علمی کام کیا اور کتابیں تصنیف کیں ۔

(۶)

کتاب کا ایک دلچسپ پہلو تقابلی مطالعہ ہے جس میں انھوں نے

پنجاب و سرحد میں خاص خاص موضوعات کی مقبولیت اور دلی اور اس کے نواح کے مستشرقین کے مختلف رویے کو دریافت کیا ہے - ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت نے مقامی باشندوں پر بغاوت کا الزام لگایا اور معاندانہ روش اختیار کی - ۱۹۳۰ء کے بعد سے یہ احساس شدید ہوگیا اور تحقیری رویہ ابھرا - برطانوی رویے میں اس تبدیلی کے مضمرات کو بھی مقالہ نگار نے بڑی مہارت سے پیش کیا ہے -

مجموعی طور پر مقالے کی بنیادی اہمیت تحقیقی سے زیادہ تنقیدی ہے اور یہ اس قابل ہے کہ اسے شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ کے بعض خلا پر کر دیے جائیں -

---

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

(۱)

اس ربع صدی میں دو کتابوں کی دریافت اور اشاعت تاریخ ادب اردو کے لیے بعض دور رس نتائج کا باعث ہوئی ۔ ایک زمانہ تھا جب اردو نظم و نثر کی تاریخ ولی سے پیچھے نہ جاتی تھی اور لسانی مراحل کا تعین قیاسات اور فرضی حقائق کی بنا پر ہوتا تھا ۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی اشاعت نے اردو ادب کا دائرہ وسیع کر کے دسویں صدی ہجری تک پہنچا دیا ۔ دکنیات نے اردو ادب کے تسلسل کو بحال کیا اور شعری روایت کے مد و جزر ہی کا سراغ نہیں لگایا بلکہ لسانی مباحث کو ایک نئی جہت بھی عطا کی ۔ معراج العاشقین سے قطع نظر کہ اس کے لیے یقین اور بدگمانی کے کئی دعوے موجود تھے ، نظامی دکنی کی مثنوی کی اشاعت سے اردو ادب کی تاریخ بلا شبہ دو صدیاں پیچھے چلی گئی ہے ۔ اس کی مدد سے لسانی تغیرات کی جو روایت ولی تک قائم ہوتی ہے اس سے معراج العاشقین کی حیثیت اور بھی مشکوک ہو گئی ہے ۔ دوسری کتاب جس نے اردو کے ادبی سرمائے کو ایک بار پھر لسانی نقطہ نظر سے الٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے وہ فضلی کی کربل کتھا ہے ۔ جنوب اور شمال کی ادبی روائتوں کی شناخت اور ان کے عہد بعہد ارتقاء کا دائرہ تاریخ ادب کے نقادوں ہی کے لیے نہیں لسانیات کے ماہروں کے لیے بھی کئی چیلنج رکھتا ہے ۔ اردو ادب کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی نظامی دکنی کی مثنوی اور کربل کتھا دو اہم انکشافات شمار ہوتے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر اردو ادب کی روایت کے علاوہ لسانی روایت کی شناخت کے مباحث بھی غور و فکر کی نئی راہیں کھولتے رہیں گے ۔

(۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی نظامی دکنی یعنی کدم راؤ پدم راؤ

کو دریافت تو نہیں کیا کہ ان سے پہلے مولوی عبدالحق یہ سہرا اپنے سر باندھ چکے تھے ، البتہ اس کے ناخواندا متن کو چھاپنے کا کام ایک عرصے تک ملتوی رہا ۔ ڈاکٹر جالبی نے پانچ برس کی محنت سے اس نامکمل مثنوی کو اب چھاپ دیا ہے ۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے اشاعتی پروگرام میں تقسیم برصغیر کے بعد غالباً یہ پہلا اہم علمی کارنامہ ہے ۔ فوٹو آفسٹ پر ہر صفحے کا عکس بھی شامل ہے اور مقابل کے صفحے پر جالبی صاحب کا تیار کردہ متن چھاپ دیا گیا ہے ۔ متنوں کی تصحیح عام طور پر بڑا آسان کام سمجھا جاتا ہے ۔ جہاں فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی مطبوعہ کتابوں کو کاتب کے حوالے کر دینے کا نام تدوین متن سمجھا جاتا ہو وہاں نسخے کے اصل متن کا عکس شریک اشاعت کرنا اس لیے بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مرتب کی محنت اور عرق ریزی کا صحیح اندازہ تقابلی مطالعے ہی سے ممکن ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قلمی نسخے کے تسامحات ، کاتب کے خصائص کتابت اور قدیم طرز املا کی دقتوں کو حل کرنے کے لیے جس محنت ، حوصلے ژرف بینی اور احتیاط کی ضرورت ہے ، فاضل مرتب نے اس کا پورا پورا لحاظ کیا ہے ۔ ہمارے معاشرے میں اس طرح کی محنت کا رواج کچھ کم سا ہوتا جا رہا ہے ایسے میں اس مثنوی کی اشاعت اور تدوین کارنامے سے کم نہیں ۔ جمیل جالبی اس سے پہلے دکنیات کے دو تین متن شائع کر چکے ہیں ۔ اس کے بعد انھوں نے اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالا ہے ۔ یہ وہ بھاری پتھر تھا جسے (اس کتاب کے ابتدائیہ نگار نواب زادہ جمیل الدین عالی نے بھی اس کا اقرار کیا ہے) اکثر محققوں نے چوم کر چھوڑ دیا تھا ۔ یوں بھی منحصر بہ فرد نسخے کی تدوین جان جوکھوں کا کام ہے ۔ مرتب نے مختلف حروف کے دائروں اور املا کے خصاص کو مختلف اوراق کے باہمی تقابل سے کچھ اس طرح حل کیا ہے کہ ایک ہزار بتیس اشعار کے اس مجموعے میں اب صرف چند مقام ہی لاینحل رہ گئے ہیں ۔ شروع میں ساٹھ صفحے کا مفصل دیباچہ بھی شامل ہے ۔ جس میں زمانۂ تصنیف ، مثنوی کے نام ، مصنف کے حالات ، خلاصۂ مماثلات املا اور کاتب کے علاوہ کتاب کے لسانی اور ادبی پہلوؤں پر کھل کر بحث کی گئی ہے ۔ متن کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شریک ہے ۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں ، ایک سلاطین بہمنی کے حال میں دوسرا ان شخصیات کے بارے میں جو مثنوی میں آئی ہیں ۔ آخر میں مآخذ

کی فہرست بھی شامل ہے ۔

(۳)

کتاب کا بنیادی حصہ مثنوی کے متن پر مشتمل ہے جس میں اس روایت کی پابندی کی گئی ہے جس کے سرخیل حافظ محمود شیرانی اور آخری اہم رکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ہیں ۔ گویا مرتب نے متن کی اس ٹکنیک کو اختیار نہیں کیا جو دکنیات کے لیے ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھیوں نے اختیار کی تھی اور جس میں صرف سیاق عبارت تک اپنے آپ کو محدود رکھا جاتا تھا اور اٹکل سے لفظوں کی شناخت ہوتی تھی ۔ انھوں نے قلمی نسخے کے انداز کتابت اور املائی خصوصیات کو سیاق عبارت کے ساتھ ملا کر دیکھا ہے اور اپنی مساعی کو امکانی حد تک آگے لے گئے ہیں ۔ اس کی پہچان کہ انھوں نے اپنے طریق کار کو ایک ایک شعر پر منطبق کیا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اتنے مشکل متن میں صرف گنتی کے مقام رہ گئے ہیں جو حل نہیں ہو پائے ۔ قاری کے لیے یہ بھی ایک آزمائش ہے کہ نسخے کے شائع شدہ عکس کو سامنے رکھ کر ان خلاؤں کو پُر کرے جو فاضل مرتب سے حل نہیں ہو سکے ۔

(۴)

قلمی نسخے کے کاتب کے بارے میں جالبی صاحب نے کچھ زیادہ نہیں لکھا ، یہ مسئلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اسے معاصر نسخہ جانے یا بعد کا مخطوطہ شمار کرلے ۔ نواب جمیل الدین عالی نے اسے چھ سو برس کا مسودہ قرار دے کر معاصر نسخہ گردانا ہے اس سے لسانیات کے طالب علموں کے لیے کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ یہ درست ہے کہ کتاب میں ترقیمہ نہیں ہے ، یہ بھی صحیح ہے کہ محض خط سے زمانے کا تعین پوری طرح ممکن نہیں لیکن آج کے زمانے میں فنون نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کسی لیبارٹری میں آسانی کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کا زمانہ قطعی طور پر معین ہو سکتا تھا ۔ اگر برٹش میوزیم کی لیبارٹری سے استفادہ کر لیا جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا ۔ شائع شدہ متن کی بنیاد پر یہ قیاس بے موقع نہ ہو گا کہ نسخے کی املا گیارھویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہوگی ۔ نسخے کا

یہ رجحان جو اس نسخے میں ہے چھٹی صدی میں فارسی میں شروع ہوا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی تک بعض حروف کے دوائر کو حاشیے میں دور تک کھینچ کر لے جانے کا طریقہ عام تھا - ت - ٹھ اورگ کی مرقومہ صورتیں جو نویں ، دسویں ، گیارھویں اور بعض خاص خاص صورتوں میں بارھویں صدی کے اوائل تک آئی ہیں لیکن بعض داخلی شہادتیں کاتب کو نویں صدی ہجری سے متعلق کرنے سے مانع ہیں - دکنی اردو میں "ہور" کی جگہ "اور" کا استعمال گیارھویں صدی میں عام ہے لیکن نویں صدی میں اس کا رواج مشکوک ہے ، کم از کم چار مقامات پر "اور" کا استعمال (۲۱۳ ، ۲۸۹ ، ۳۹۵ ، ۸۹۵) کاتب کی دخل اندازی سمجھا جائے تو زمانۂ کتابت بخوبی گیارھویں صدی قرار پا سکتا ہے - اسی طرح "جیو" کی جگہ "جی" (ص ۱۵۵) بھی کاتب کی کارستانی ہو تو عجیب نہیں - شعر ۵۴۱ ، ۵۵۵ اور ۶۲۰ میں ٹھانو ، نانو ، پانو ، چھانو ، نانو رقم ہیں اور نون غنہ کے بغیر یہی املا نویں دسویں صدی ہجری کی ہے - لیکن شعر ۸۵۰ میں "کٹانوں" نون غنہ کے ساتھ درج ہوا ہے - اسی طرح "یہ" کا استعمال گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کی چیز ہے اور اس کی جگہ "یو" مستعمل تھا - شعر نمبر ۵۰۶ اور ۶۹۶ میں "یہ" کا لفظ پایا جاتا ہے - قیاس ہو سکتا ہے کہ نسخے کے کاتب کا زمانہ گیارھویں صدی کا اوائل یا حد دسویں کا آخر ہے - کاتب کے مسئلے کو چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیباچے میں کہیں کہیں کاتب کا مال نظامی کے حساب میں جمع ہو گیا ہے ؛ مثلاً ص ۵۹ پر دو چشمی ھ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں نظامی کا کچھ دخل نہیں کیونکہ املائی خصائص کو بہرحال کاتب ہی کے کھاتے میں جانا چاہیے تھا تا آنکہ کوئی داخلی شہادت وزن یا قافیے کی صورت میں برعکس تعین نہ کرتی ہو -

قلمی نسخے پر کہیں کہیں ترمیم و اصلاح کا عمل بھی دکھائی دیتا ہے - بعض غلط لفظوں کو متن میں کاٹا یا بدلا گیا ہے اور حاشیے پر کہیں کہیں صحیح صورت کا دوبارہ اندراج ہوا ہے - بیشتر ترمیمیں کاتب کے قلم سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کا امکان بھی ہے کہ بعض جگہ کسی مؤخر کاتب نے لسانی ڈھانچے کو اپنی صوابدید کے مطابق بدلا ہو - ص ۴۴ و

پر "چمکتار مجھ" میں "مجھ" کو "مجھے" بنانے کا عمل اور "ر" کو "ے" کے ساتھ ملا دینے کا انداز اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترمیم کرنے والے نے "چمکتار مجھ" کو "چمکتا مجھے" سمجھا ہے "مجھے" کی یہ صورت بارھویں صدی کے کسی کاتب کا کرشمہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ قیاسات ہیں جن کے لیے تائیدی مواد کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان مسائل کا قطعی حل لیبارٹری ہی میں ممکن ہے۔ اگر اس کا اہتمام کر لیا جاتا تو بعض مقامات پر متن کے تعین میں مرتب کی دشواریاں کم ہو سکتی تھیں۔

(۵)

یہ قابل داد ہے کہ متن کی صحت میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم کاتب نے چند مقامات پر اپنی سوجھ بوجھ کو بھی شریک متن کر لیا ہے:

۱ - شعر ۷ "ادھک" کو "ادک" لکھا ہے
۲ - شعر ٦٦ "تھئی" کو "تھی" لکھا ہے
۳ - شعر ۳۹۱ "چند" کو "چندر" لکھا ہے
۴ - شعر ٦٠۴ "رو چند" کو "رو جند" لکھا ہے
۵ - شعر ۵۲٦ "تویں" کو "تمہیں" لکھا ہے
٦ - شعر ۴۰۷ "پکڑوں" کو "پکڑن" لکھا ہے
۷ - شعر ۷۵۱ "تہ" کو "یہ" لکھا ہے
۸ - شعر ۹۷۰ "گھات" کو "ناٹ" لکھا ہے

بعض جگہ کاتب نے یوں بھی نقصان پہنچایا ہے کہ مرتب کے اضافوں کو قوسین میں نہیں رکھا۔ مثلاً شعر نمبر ۱۰۱۳ میں آخری "ہوں" مرتب کا اضافہ تھا جسے قوسین میں رکھنے کی ضرورت تھی، اسی طرح شعر ۲۰۸ میں "پچھتاؤ" کے آخر میں "و" کا اضافہ مرتب نے کیا تھا لیکن یہاں بھی قوسین غیر حاضر ہیں۔ شعر نمبر ۱۴ میں "کر" کے بعد "لیے" کا اضافہ

مرتب کا ہے شعر نمبر ۱۸ میں بھی "بدھ" کی آخری دو چشمی ھ مرتب کے اضافہ کی ہے یہاں بھی کاتب نے قوسین کو حذف کر دیا ہے ۔

فاضل مرتب کی انتھک محنت کی پوری داد دیتے ہوئے بعض جگہ ان کے متن سے معمولی اختلاف بھی ممکن ہے ۔ ہو ہذا :

۱ - شعر نمبر ۵۷ میں "بیجلی" نسخے میں بجلی ہے یہاں اردو شہپارے کی فرہنگ میں درج شدہ لفظی صورت کو ترجیح دی گئی ہے ۔ نسخے میں اگر کاتب کی ترمیم نہیں ہے تو بجلی کو تشدید کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اور علاقائی زبانوں میں یہ صورت آج بھی رائج ہے ۔

۲ - شعر ۱۰۰ اور ۵۹۱ میں "دنیا" کا لفظ درج ہے قلمی نسخے میں "دنی" لکھا ہے اگر چھپائی میں چھوٹا الف حذف نہیں ہوا تو آسے "دنی" پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے ۔ بدیں صورت دیباچے کے صفحہ ۳۸ کی مثال حذف ہو سکتی ہے ۔

۳ - شعر ۲۰۲ کے پہلے مصرعے میں "کہ" کے بعد قوسین میں "ہوئے" کا اضافہ ہو سکتا ہے ۔

۴ - شعر ۲۲۷ میں پہلے مصرعے میں "نہ" کے بعد ایک اور "نہ" پڑھا جائے ۔ قلمی نسخے میں بھی یہی صورت معلوم ہوتی ہے ۔

۵ - شعر ۲۳۱ کے دوسرے مصرعے میں قوسین کے اندر "اور" کی بجائے "ہور" کو رکھنا شاید زیادہ موزوں ہوگا ۔

۶ - شعر ۳۳۸ کا پہلا مصرعہ یوں پڑھا جا سکتا ہے :
بہت جیو گھا (وا) ہوا گھاؤ توں

۷ - شعر ۳۵۷ کا پہلا مصرعہ یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :
دیے کپڑے ایکس اک تن و تن

اس طرح کی واوِ عطف قدیم میں رائج تھی اور کاتب نے "ر" اور "و" کی املا میں قلمی نسخے میں جا بجا ایک سا انداز رکھا ہے ۔

۸ - شعر ۴۴۵ کے دوسرے مصرعے میں "کزبد" کی بجائے "کذب" پڑھا جائے ۔

۹ - شعر ۱۷۲ میں دوسرا مصرعہ قیاساً یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :
کہ دشمناں توں بدی منجہ (کوں) سکھاؤ

۱۰ - شعر ۵۰۳ میں دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے :
کہ اس بدھ تھیں کیوں جلنہار ہوئے

"جلن ہار" کا لفظ شعر نمبر ۲۳۲ کی املا پر قیاس کر کے پڑھا گیا ہے -

۱۱ - شعر ۵۳۵ کا دوسرا مصرعہ یوں ہے :
پڑی آس پر منجہ کروں تجہ حرام

۱۲ - شعر ۵۸۶ میں "کچ" کو میں ''کج'' پڑھتا ہوں - اسی طرح شعر ۵۰۷ اور ۹۵۷ میں بھی ہے -

۱۳ - شعر ۲۲۲ کا دوسرا مصرعہ مرتب نے یوں پڑھا ہے :
اسنگت کے وہ من لگے بھی نہیں

اور شعر ۶۵۰ کا پہلا مصرعہ یوں درج کیا ہے :
کہیں باپڑانار ہوں میاں کال

دونوں جگہ نہیں اور کہیں کی املا مسودے میں ایک سی ہے یا دونوں جگہ "نہیں" پڑھیے یا دونوں جگہ "کہیں" "تمہیں" پڑھنا بھی ممکن ہے -

۱۴ - شعر ۶۹۸ یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :
کتھا کھیل شطرنج بازی سو کھیل
ولے سینہ پکڑے گرا چھوڑ کھیل

۱۵ - شعر ۶۹۹ میں دوسرا مصرعہ اسی طریق کار کے مطابق جو دیگر مقامات پر پیش نظر رکھا گیا ہے یوں ہوگا :
پکڑ بیڑئیں ذات سولی دھرے

۱۶ - اشعار ۲۸، ۲۷، ۲۹ میں "منجھکری" اور "پنجھکری" بظاہر ایک ہی لفظ ہے ممکن ہے پنجابی انداز میں "پنجیں گھڑی" (پانچوں وقت) لکھا ہو اور کاتب نے ادل بدل کر دی ہو ۔ لفظ کو اس طرح پڑھنے سے دونوں شعر پورے ہو جاتے ہیں بہ اعتبار وزن بھی اور بہ اعتبار معنی بھی ۔

۱۷ - شعر ۳۹ میں "ہوا" نہیں بلکہ "ہول" پڑھا جائے "ل" کا املا واضح طور پر نسخے میں ہے ۔ ان معنوں میں ہول (=ہو+ول) "ہو کر" کے معنوں میں شمار ہوگا ۔

۱۸ - شعر ۴۳ کو میں یوں پڑھتا ہوں :

اگر چور وہ جوئی یا ہوئے ساہ
پکڑ بیٹھ کو تس بہتر گھوڑے باہ

قلمی نسخے میں "جوئی" صاف درج ہے "بکر" کو شعر ۲۰۱ کے قیاس پر "پکڑ" پڑھیں گے ، "باہ" بمعنی "بیٹھ کر" ہے ۔

۱۹ - شعر ۸۵ کا پہلا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے :

جو ہونٹ اُس دکھاوے (کہوں) ہونٹ (توڑ)

جو ادبا متن کی مشکلات سے خائف ہوں ان کے لیے جالبی صاحب نے دیباچے میں غور و فکر کا خاصا سامان مہیا کر دیا ہے ۔

دیوانِ حسن شوقی

(۱)

دسویں صدی ہجری کے اُردو شاعر شوقی کی دو مثنویاں ، تیس غزلیں اور ایک نظم اس مجموعے میں شامل ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے انجمن ترقی اُردو کراچی بعض اہم بیاضوں سے شوقی کا یہ کلام لے کر ترتیب دیا ہے - متن کے علاوہ ایک مفصل مقدمہ اور آخر میں فرہنگ درج ہے -

(۲)

جمیل جالبی ایک نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں - اس کتاب سے ان کے مزاج کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے- تحقیق و تصحیح کا یہ اہتمام جو انھوں نے کیا ہے اس کی توقع کسی نقاد سے نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے کہ تحقیق اور تنقید اُردو میں اس طرح الگ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں کہ نقادوں کے نزدیک تحقیق محض ایک میکانکی عمل ہے اور محققین کے نزدیک کسی ادب پارے سے تنقیدی نکات کا استخراج دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے - ایسے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا دیوان شوقی ترتیب دینا اور اس میں تصحیح متن کے مشکل اور بظاہر غیر دلچسپ کام کو بخوبی انجام دینا یقیناً حیرت انگیز مسرت کا باعث ہے - تصحیح میں جس محنت ، ژرف نگاہی ، احتیاط اور قدیم متون سے واقفیت کی ضرورت ہے جالبی صاحب نے اس کا لحاظ رکھا ہے - دکنیات کے جو متن اب تک شائع ہوئے میں ان میں بیشتر کی تصحیح اور ترتیب کا کام ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، نصیر الدین ہاشمی‌اور عبدالقادر سروری نے انجام دیا ہے - موجودہ متن کا ان متنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جالبی صاحب نے صحت متن میں دوسرے محققین کے مقابلے میں زیادہ محنت اور دقت نظر سے کام لیا ہے - ان کے متن کے غیر حل شدہ حصے بہت کم ہیں -

کتاب کا دیباچہ اس نئی دریافت کی لسانی اور ادبی حیثیت کو متعین ہی نہیں کرتا بلکہ تاریخ ادب میں دکنی روایت کی کڑیاں بھی آردو شاعری کے بعد کے ادوار سے ملاتا ہے ۔ نصرتی سے لے کر ولی تک شاعری کی جو روایت پراون چڑھی ہے اس کے بارے میں نقادوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ۔ ولی کو عموماً اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک صبح بیدار ہوئے اور انھوں نے طے کیا کہ آئندہ سے فارسی اثرات کو قبول کرتے ہوئے شعر کہا کریں گے ۔ جالبی صاحب ولی کو دکنی روایت سے الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں ، انھوں نے نصرتی سے لے کر ولی تک کی دکنی شاعری میں جس طرح فارسی روایت کے انجذاب کا عمل ہوتا رہا ہے اس کا سراغ لگا کر ادبی روایت کے تسلسل کی نشاندہی کی ہے ۔ اسی اعتبار کے وہ حسن شوق کے کلام کو ایسا "درمیانی پل" قرار دیتے ہیں جس کے بغیر روایت تک نہیں پہنچا جا سکتا ۔ روایت کے اس تسلسل سے جالبی صاحب نے بعض دوسرے اہم نتیجے بھی نکالے ہیں مثلاً فرماتے ہیں :

> (۱) "جیسے دسویں صدی ہجری کی قدیم غزل پر محمود ، فیروزہ اور خیالی کا سایہ پڑتا نظر آتا ہے ، اسی طرح نصف سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری تک حسن شوق کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے اور پھر یہ اپنا رنگ دوسرے رنگوں میں ملا کر خود ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے"
>
> (۲) "حسن شوق کی زبان اس زمانے کے دکن کی عام بول چال کی زبان ہے ۔ اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پکتی دکھائی دیتی ہے جو آئندہ زمانے میں ایک جان ہو کر اردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں ۔ زبان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اپنے ارتقاء کی اس ترکیبی منزل میں ہے جہاں سے اردو حروف علت کا موجودہ نظام پروان چڑھنے لگا ۔ اس کی سب سے واضح شکل صیغہ ماضی کے افعال میں ملتی ہے"

(۳)

جمیل جالبی تحقیق میں پروفیسر شیرانی کے طریق کار سے بہت متاثر

ہیں ۔ لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخ بھی ان کے پیش نظر ہے اور دونوں کی روشنی میں نتائج ترتیب دیتے ہیں ۔ شیرانی صاحب کا یہ اثر صرف یہیں تک نہیں بلکہ دلائل کی ترتیب میں بھی جاری و ساری ہے ۔ فتح نامہ نظام شاہ کے قلمی نسخوں پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے اختلاف کیا ہے اور نسخہ ثانی کے اشعار کو الحاقی نہیں بلکہ اصلی مانا ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے سات دلیلیں قائم کی ہیں ۔ شیرانی صاحب کی طرح ان دلائل کی ترتیب میں انھوں نے قیاسی اور غیر یقینی دلیلوں کو پہلے اور حتمی دلائل کو آخر میں جگہ دی ہے ۔ قاری کو چونکا دینے والا یہ طریق کار شیرانی صاحب سے خاص ہے ۔ جالبی صاحب نے بھی ناقابل تردید دلائل کو سب سے آخر میں جگہ دے کر قاری کو تحیر اور استعجاب میں ڈالا اور اس طرح دلائل کو پیش کرنے کا وہ اسلوب اختیار کیا ہے جس میں محقق کے دلائل کو تسلیم کیے بغیر پڑھنے والے کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا اور دلائل کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے وہ محقق کا ہم نوا ہو جاتا ہے ۔

(۳)

تحقیقی لحاظ سے دیباچے کے دو حصے سب سے زیادہ اہم ہیں ، ایک وہ جہاں فتح نامے کے اشعار کو غیر الحاقی قرار دیا گیا ہے ، دوسرا وہ حصہ جہاں میزبانی نامہ کے نواب مظفر خان کا تعین کیا گیا ہے ۔ واقعاتی تحقیق کے علاوہ لسانی مسائل میں بھی جالبی صاحب نے اہم باتیں کی ہیں ۔ لسانی مطالعہ کے زیر عنوان پیش کیے گئے ان نتائج سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا جا سکتا ہے ؛ لیکن مجموعی طور پر ان کے اہم اور نتیجہ خیز ہونے میں کلام نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے قدیم اردو کے لسانی مطالعے میں سندھی زبان کو پیش نظر رکھا ہے پنجابی کی اہمیت کو تسلیم تو کیا ہے لیکن اسے بہت دور تک لے جا کر نہیں دیکھا اس لیے ان کی بعض آراء سے جزوی اختلاف ممکن ہے ۔ یہ درست ہے کہ پنجابی اور سندھی میں ساخت کے اعتبار سے بعض عناصر مشترک ہیں لیکن جالبی صاحب اسے صرف سندھی سے مخصوص خیال کرتے ہیں حالانکہ پنجابی بھی اس عنصر سے خالی نہیں ۔

وہ فرماتے ہیں کہ "اردو اور سندھی میں حرف ربط تقریباً ایک سے

ہیں فرق اتنا ہے کہ سندھی میں "آ ے" بہت کھینچ کر اور دکنی میں قدرے تخفیف سے بولا جاتا ہے"۔ آ ے کی یہ تحقیقی صورت ملتان اور ساہیوال کے علاقوں میں اب بھی پائی جاتی ہے اور اس کا رشتہ سندھی سے کہیں زیادہ پنجابی سے ملایا جا سکتا ہے۔ حروف جار کی بحث کرتے ہوئے سرائیکی "کوں" اور "کی" کی شکل "منے" بھی بیان ہوئی ہے۔ یہ شکلیں سرائیکی کے علاوہ پنجابی میں بھی مستعمل ہیں۔ منے کا لفظ "کی طرف" کے معنوں میں ابھی تک پنجابی میں زندہ ہے۔ سندھی اور اردو زبان کی مماثلت کے ثبوت میں انھوں نے میزبانی نامے کے ابتدائی سو اشعار میں سے سندھی کے مشترک الفاظ جدا کیے ہیں ان الفاظ میں اسیؔ فی صد پنجابی اور سندھی کے مشترک الفاظ ہیں انھیں صرف سندھی قرار دینا لسانی اعتبار کے بعض غلط نتائج کی طرف راہنمائی کر سکتا ہے۔ فہرست میں ذیل کے الفاظ پنجابی کے زندہ الفاظ ہیں اور انھیں کسی صورت میں صرف سندھی سے خاص نہیں قرار دیا جا سکتا :

سٹن ، ماڑیاں ، مڑے ، وتے ، پھل ، سکال ، رے ، سریہ ، لیّے ، بھوئیں ، سالو ، ہتھ ، رتڑے ، مُچلی ، کاچتے ، دوہڑے ، ڈیوٹیاں ، سینا ۔

معانی میں بھی بعض جگہ جالبی صاحب سے کسی قدر اختلاف ہے مڑے کا معنی کشیدہ کاری کرنا اور آراستہ کرنا درست نہیں منڈھنا صحیح ہے۔ وتے کی اصل شکل وت کا مطلب پھر اور بار دیگر ہے۔ گاجنا ہاتھی کی آواز کے لیے مخصوص نہیں ، ممکن ہے ابتدا میں ایسا ہو ، اب گرجنا کے معنوں میں مستعمل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کی تیسری اہم خصوصیت املا سے متعلق مباحث ہیں ؛ مثلاً حرف اضافت کی بجائے ے کا استعمال جیسے منارے عظیم (منار عظیم) شیرے شیر مرد (شہ شیر مرد) شہے نامدار (شہٗ نامدار) وغیرہ کے عام استعمال اقرار کرتے ہوئے ان کا خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ اسلوب اس دور میں عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط تک ہمیں اردو کے جو قلمی نسخے ملتے ہیں ان میں حرف اضافت کے بجائے "ے" کا استعمال جاری ہے اور اس رجحان کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اردو کا بنیادی لسانی مزاج صوتی اعتبار سے "ے" اور حرف اضافت کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔ معلوم نہیں جالبی صاحب اس سے اتفاق کریں گے یا نہیں کہ

اگر شمالی ہندوستان میں فارسی کی لسانی روایت زیادہ قوی نہ ہوگئی ہوتی تو حرف اضافت کی بجائے "ے" کا استعمال آج بھی عام ہوتا۔ انھوں نے اپنے متن میں دور حاضر کے املا کی پابندی کرتے ہوئے حرف اضافت کو بحال کر دیا ہے ایک آدھ جگہ اگر ایسا نہیں ہو سکا تو یہ شاید کاتب کی زبردستی ہے۔ صفحہ ۱۵۰ پر شہ کی جگہ شہے درج ہو گیا ہے۔ اسی طرح املا کے سلسلے میں جالبی صاحب نے س، ث، ص، ض، ظ اور ذ کی باہمی آوازوں کی مشابہت کا اثر املا پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"میں نے ایسے الفاظ کا املا درست کیا ہے جو اس وقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے جیسے غوص اعظم کو غوث اعظم کر دیا ہے۔ حجرت کو ہجرت اور نصل کو نسل۔"

مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اختلاف ہے کہ یہ لفظ اس زمانے میں صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے۔ حرف اضافت کی بجائے "ے" کے استعمال کی مذکورہ حروف کی صوتی حیثیت ہی ان کے ادل بدل کا سبب بنی ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ تیرھویں صدی تک کے قلمی نسخوں میں املا میں بھی یہی صورت کارفرما ہے۔ اس لیے اس صورت حال کو ہم کیوں نہ صوتی تبدیلیوں کے ذیل میں شمار کرتے ہوئے تیرھویں صدی تک کا مسلمہ صوتی رجحان تسلیم کر لیں کیونکہ بعض صاحب علم کاتبوں کے ہاں بھی یہ عمل جاری دکھائی دیتا ہے۔ میرے نزدیک اسے ایک فطری لسانی عمل قرار دینا مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید املا کے مطابق یہاں بھی اصل حروف کو بحال کیا ہے لیکن ایک آدھ لفظ ان کی نظر سے اب بھی رہ گیا ہے، مثلاً اس شعر میں:

ہمارا حسن ہے شوق معلم ذہن کوں تیرے
سبق کچھ الصری کا یا درس کچھ انوری کا ہے

یہاں "انصری" "ع" سے ہونا چاہیے تھا۔

(۵)

دیباچے کے بعد اصل متن آتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی

محنت اٹھائی ہے صرف دو تین مقامات پر اختلاف کی گنجائش ہے ، مثلاً ص ۹۴ :

ہر سطر میں لفظ زیبا فریب ہر لفظ معنی شکیبا شکیب

اس شعر میں "زیبا فریب" غالباً کاتب کی کارفرمائی ہے "زیبا و زیب" ہو گا وکوف سمجھ لیا گیا ہے - ص ۱۷۵ :

کبھیں الوان ہم کھاویں کبھی ٹوکے ملیں روکھے
کبھیں بھا جی کبھی پالا کبھی دن چار کے بھوکے

کبھیں رن بن ہمیں ہنڈیں کبھیں بستی منے سوتے
کبھیں دکھیا کبھیں سکھیا کبھیں ہنستے کبھیں روتے

کبھیں بالے کبھیں بوڈے کبھیں سیوک کبھیں سامی
کبھیں گرہو کبھیں چیلے کبھیں پختے کبھیں خامی

ان اشعار میں ٹوکے بھی کاتب کی کارفرمائی ہوگی لفظ "ٹوکر" ہونا چاہیے یعنی "روٹی ، ٹکر" اسی طرح "سامی" اور "خامی" کی جگہ پنجابی لسانی روایت کے مطابق "سامے" اور "خامے" پڑھا جانا چاہیے - اسی نظم میں آگے چل کر "دڑ پڑا" درج ہے جو "در بڑا" ہے - فرہنگ میں لفظ کا صحیح املا درج ہے لیکن معنی درست نہیں - در بڑا اس سالن کو کہتے ہیں جس میں گھی کم ہو اور ملغوبہ سا بن جائے یعنی یہ لفظ گاڑھے مواد کے لیے مستعمل ہے -

(۶)

کتاب کے آخر میں ایک طویل فرہنگ ہے - اس میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جو پنجابی اور دوسری مقامی زبانوں میں مشترک ہیں - فرہنگ بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے - چند مقام تصحیح طلب ہیں : مثلاً "بلندر" کے معنی بہادر لکھا ہے پنجابی میں آج بھی ہٹے کٹے ، دیو قامت اور وحشی شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے - "ٹھاڑے رہے" کا مطلب "جمے رہے" درست لیکن "مستعد رہے" غلط ہے - ساؤ بمعنی شاہ درج ہے - ساؤ "بھلے مانس" کے لیے ہے - "لیف" کا مطلب بوریا بستر نہیں "لحاف" ہے - بعض لفظوں

کے معانی متعین نہیں کیے گئے مثلاً آرابہ ، بارود خانہ ۔ بنڈے ، ایک سواری کا نام ۔ بُرد ، شطرنج کی اصطلاح ۔ بُران ، ہندوؤں کی مذہبی کتاب ۔ تافتہ ، کپڑے کی ایک قسم ۔ جیتل ، ایک سکہ ۔ حاجب ، سفیر ، سوسمار ، ایک جانور ۔ کابل ، نام مقام ۔ یشم ، ایک قیمتی پتھر ۔ عام لغت کے انداز پر درج ہوئے ہیں ۔ ان لفظوں کے معنی متعین ہیں ۔ ضرورت تھی کہ فرہنگ میں بھی پوری وضاحت کی جاتی ۔ لفظوں کی بعض املائی صورتیں بھی فرہنگ کا حصہ بن گئی ہیں جو میرے نزدیک درست نہیں ۔ لاگے ، لاگے ۔ لک ، لگ ۔ وغیرہ کو لغت کا حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا ۔ بعض لفظوں کے معانی بھی مزید غور کا تقاضا کرتے ہیں ۔ اڑ کا معنی غرور دیا ہے ، ہٹ اور ضد کے معنوں میں اب بھی رائج ہے ۔ انڈیاں کا مطلب ''انڈے'' دیا ہے حالانکہ چھوٹے انڈوں کو انڈیاں کہتے ہیں ۔ بالن کا مطلب جلانا دیا ہے ، بالنا کا جلانا تو ہے لیکن بالن جلانے کی لکڑی کو کہتے ہیں ۔ بومڑی کا معنی شور دیا ہے ۔ بُوبُو کی ترکیب شور و غوغا کے لیے پنجابی میں اب بھی مستعمل ہے ، اس طرف اشارہ ضروری تھا ۔

فرہنگ میں بعض جگہ ماضی یا ماضی استمراری کے صیغوں میں لفظ درج ہیں لیکن معانی میں مصدری شکل اختیار کی گئی ہے ۔ اگر اس کا لحاظ کر لیا جاتا تو اچھا تھا ۔

حالات حسن کے دو ماخذ

(۱)

اردو کے دوسرے قدیم شعراء کی طرح میر حسن کے مفصل حالات بھی نہیں ملتے - معاصر تحریروں میں حسن کے حال کے لیے قدیم ترین بیان گلزار ابراہیم کا ہے جو میر حسن کے اپنے بھیجے ہوئے حالات پر مبنی ہے - ان کے حلقۂ احباب میں بھگوانداس بھی تھے جن کا سفینۂ ہندی بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے - یہ تذکرہ اگرچہ میر حسن کی وفات کے بعد لکھا گیا لیکن صاحب تذکرہ حسن سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور ان کے والد سے بھگوانداس کے دوستانہ روابط تھے - اس لیے حسن کے حال کے لیے یہ بھی اہم ہے - اسی طرح کمال کا مجمع الانتخاب ہے - قدرت اللہ شوق کا طبقات الشعراء بھی میر حسن کے زمانے کا تذکرہ ہے لیکن حسن کے حال میں کوئی خاص بات پیش نہیں کرتا - تذکرۂ مسرت افزا اگرچہ میر حسن کے حین حیات میں لکھا گیا لیکن اس میں ان کا ترجمہ تمام و کمال تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) سے ماخوذ ہے - مصحفی کا تذکرۂ ہندی بھی اسی زمانے کی چیز ہے اور اس کے محتویات عام طور پر معلوم ہیں - مبتلا کا طبقاتِ سخن ، قاسم کا مجموعۂ نغز اور احد علی یکتا کا دستور الفصاحت بھی میر حسن کے قریبی زمانے کی چیزیں ہیں - ان سب کتب سے حسن کے حالات پر تسلی بخش روشنی نہیں پڑتی - اب لے دے کر میر حسن کی اپنی تحریریں ہیں جن پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے - ان میں سے تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کچھ درج ہے عام طور پر معلوم ہے - عہد حاضر کے مصنفین نے حسن کے حالات کے لیے بالعموم اسی پر انحصار کیا ہے - کلام حسن سے اس پر مزید کوئی اضافہ نہیں ہوتا ؛ البتہ دیباچۂ دیوان حسن ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے - دیباچۂ دیوان حسن کا ذکر اب سے قبل دو ادیبوں نے کیا ہے - واقعات انیس میں میر مہدی حسن احسن

لکھنوی نے (اصح المطابع ٹھوی ٹولہ لکھنؤ[1]) میں اس کا ایک اقتباس درج کیا۔ مرزا علی حسن نے غزلیات میر حسن (غیر مطبوعہ[2]) کے دیباچے میں اس سے کچھ کام لیا ہے ۔ لیکن دونوں ادیب اس بات کے مقر ہیں کہ یہ دیباچہ کلیات حسن کا ہے ، حالانکہ یہ دیوان حسن کا دیباچہ ہے کلیات کا نہیں ۔ علاوہ ازیں اس کے نفس مضمون سے ان صاحبوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے اس میں بہت کچھ تسامحات ہوئے ہیں ۔ دوسری تحریر جو حالات حسن پر روشنی ڈالتی ہے ۔ وہ میرشیر علی افسوس کا دیباچہ سحرالبیان ہے ۔ یہ دیباچہ مثنوی کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا ۔ "سحر البیان کے بعض ایڈیشنوں میں میر حسن کا حال اسی مآخذ سے لیا گیا ہے[3]" علاوہ ازیں حسن کے حال کے لیے دتاسی نے اپنی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی[4] میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ کریم الدین کے طبقات شعرائے ہند میں میر حسن کا حال دتاسی ہی سے لیا گیا ہے ۔ اس درمیانی واسطے کے سبب میر حسن کے حالات میں کریم الدین سے بعض غلطیاں بھی ہو گئی ہیں[5] ۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد نے کریم الدین کی عبارت سے فائدہ اٹھا کر حسن کا حال لکھا ہے[6] ۔

ان مآخذ کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں ہم انہیں دونوں کو پیش کرتے ہیں ۔

(۲)

پہلے دیباچہ دیوان حسن پیش کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ۔ یہ دیباچہ مکمل طور پر اب سے پہلے شائع نہیں ہوا ۔ اس کا متن برٹش میوزیم کے نسخہ کلیات حسن کے مائی کرو فلم پر مبنی ہے ۔ یہ نسخہ

---

۱ ۔ ص ۲۰ تا ص ۲۳ ۔
۲ ۔ طبع ۱۹۴۳ء ص ۳ تا ص ۱۰ ۔
۳ ۔ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۲۶ء ص ۳ ۔
۴ ۔ طبع ثانی جلد اول ص ۵۲۸ ببعد ۔
۵ ۔ ملاحظہ ہو طبقات شعراء ہند طبع اول ص ۲۱۳ ۔
۶ ۔ آب حیات ص ۲۵۴ ۔

شعبان ۱۲۵۹ھ میں کرنیل جارج ہملٹن کے لیے لکھا گیا اور غالباً انہیں کی وساطت سے برٹش میوزیم میں پہنچا (تفصیل کے لیے دیکھیے فہرست مخطوطات موزۂ بریطانیہ - بلوم ہارٹ) - بعض حصوں کا مقابلہ واقعات انیس کے اقتباسات اور کلیات حسن رضا لائبریری رامپور کے اقتباسات سے بھی کیا گیا ہے - کلیات حسن (رضا لائبریری) کے اقتباسات ہم نے بیاض فائق (کلب علی خاں) سے حاصل کیے ہیں اور ان کی مزید تصدیق عابد رضا خاں صاحب کے ذریعے کتاب خانۂ رامپور سے بھی کر لی گئی ہے - نسخۂ رامپور کے سر ورق کی عبارت سے خاندانی نسخہ معلوم ہوتا ہے "کلیات میر حسن گزرانیدۂ فرزند حسن نبیرۂ میر انیس یکم جولائی ۱۹۰۶ء" لیکن اس نسخے میں دیباچہ یک لخت ان الفاظ پر رہ جاتا ہے : "توقع از صاحبان معنی دارم کہ بر گاہ بہ نسبتی معانی" (اس کے بعد چند ورق غائب ہیں) - مائی کروفلم سے بعض حصے صاف نہیں پڑھے جا سکے اور ان کا مقابلہ مذکورہ مآخذ سے بھی نہیں ہو سکا - اس لیے شروع کی عبارت گنجلک رہ گئی ہے -

(۳)

(دیباچہ دیوان حسن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(صفحہ ۲۳۲) سخن سنجان گلشن مقال چوں گل رخان معانی را بر چار بالش صفحۂ دیوان زینت جلوس بخشیدہ ، اول خرگاہ حمد سبحان الذی[1] خلق الانسان و علمہ البیان[2] نمایند و انجمن آرایان شبستان خیال ہر گاہ سمن بویان ابیات را بر مسند بیاض مربع نشین می کند و تحت نشید (و بر تخت نشاند؟) صاحب و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی[3] می سرایند - اول مخمس منقبت پنجۂ قدرت کہ ید اللہ فوق ایدیھم[4] بیان اوست دست او تبر (بسر؟ برتر؟) دارند و کرسی نشینان مطلع تابر (تاثیر ؟) مر (ستیز؟ میر؟)

---

۱ - پارہ ۲۷ سورہ الرحمن (مرتب)
۲ - پارہ ۳۰ (مرتب)
۳ - سورہ نجم (مرتب)
۴ - پارہ ۲۷ (مرتب)

عزل (غزل) مقام یابند اول دوازده بند توصیف ایمہ' اطہار علیہم الصلوۃ والسلام (صفحہ ۲۳۳) الملک الغفار در پردۂ حسنی (حسن) بیان می آرند ـ من ہیچمدان تہی دست کہ از حیرت رنگ بر رو ندارم ، چناں شبیہ اطفال مقال خود را بر اوراق کاغذ نسیم (کشم ؟) کہ صاحب نظران جال آنہا دیدہ دہن بدرود کشایند ، مگر سخن آفرین قبولے بخشد کہ منظور اولی الابصار گردد ـ و حسنے عطا کند کہ دیدۂ چشم بوسان حسد کیش چوں دیدۂ تصویر بے نور شود کہ سا حون (کذا) حسن ما کم ؟ (را کم ؟) کردہ حسن قبول بگفتارم بر بحس (بر بخش ؟) یا (تا ؟) مقبول صاحبان اخلاق حسن شود ـ آمین ، رب العالمین ـ اما بعد بر سخنوران شاطر و دانشوران ماہر [مخفی نماند] کہ اصل این مولف این میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ ابن میر برات اللہ ابن میر امامی موسوی از شاہجہان آباد است کہ میر امامی موسوی در وقت شاہجہان آباد شاہ (سہو قلم : "در وقت شاہجہان بادشاہ" چاہیے) از ہرات آمدہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند ـ فاضل متبحر و فقیہ بہاں بودند و گاہ گاہ بجہت تفریح طبع فکر شعر ہم می نمودند کہ افکار معاد فرصت بے فائدہ گوئی نمی بخشند (بخشد) ، پس این عاجز بسخن را سر رشتہ' شاعری اجدادی ست نہ امروزی ، و قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ (با ؟) این ہمہ قدرت علم چوں طباع سامعاں را در سخن بلند نیافتد (نیافتند) بقدرحوصلہ' آں (ہا) بطرف ہزل توسن قلم راندند ، بحکم آں کہ ہر گاہ کہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز ـ چوں این ابجد خوان دبستان سخن در سن صغیر (کذا) کہ ہنوز ایام صبا منقضی نشدہ بود بیتے گفتہ بود و آں این است :

یک سخن گویم ترا بشنو ز من اے یار من
گر نخواہی رنج خود اے جاں مدہ آزار من

گفتہ ، بر صاحب سخناں ثابت گردیدہ کہ این طفل البتہ موزوں است[1] و ازیں کلامے مقبول تر خواہد زد ، حاصل کہ السعید من سعید فی بطن آمہ

---

۱ ـ اس کا ترجمہ مرزا علی حسن صاحب نے یوں کیا ہے "تو میرے والد نے سن کر کہا کہ بے شک یہ لڑکا موزوں ہوگا" یہ ترجمہ کسی طرح صحیح نہیں ـ

والشقی من شقی فی بطن آمہ[1] ہر کرا حق سبحانہ تعالیٰ بہ ہر کارے می آفرید ـ از صغر سن میلان طبیعت او بسوئے اکتاب [اکتساب] آں می کند [کشد] و این امور کسبی[2] نیست بلکہ موہبی است ـ لہذا عارفان ربانی زبان بطعن کسے نمی کشایند کہ نظر اوشاں بر فاعل حقیقی است و شکایت او تعالیٰ نمودن شرک عظیم عیاذ باللہ (باللہ) غرض از گردش روزگار بہ اکنون [بہ لکھنؤ] رسیدم ، گفتم زبان فارسی کہ شیخ صاحب نور اللہ مرقد از زبان حضرت قبلہ گاہی ابداللہ عاطفہ سنیدہ (شنیدہ) بحق این عاصی دعا فرمودہ اند[3] (صفحہ ۲۳۳) [و شاید این نتیجہ دعائے : برٹش میوزیم کے نسخے میں سیاہی پھری ہوئی ہے] آں بزرگ عالی قدر باشد کہ توفیق سخن یافتم و الا من کجا و این گفتگو ہا (کجا) [رباعی] اینست :

جانا(ں) ز تو امید نگاہے دارم
امید نگاہے ز تو گاہے دارم
ما کشتہ بہ چشم سرمہ سایت ہستیم[4]
نے نالہ و نے فغاں نہ آہے دارم (کذا)

و شعرے نیز بایں بود[5] :

اے شمع مپرس سر گذشتم خاموش کہ من ز سر گذشتم

چوں در فیض آباد حزب اللہ تعالیٰ عن[6] الافات رسیدم ، بخدمت میر

---

۱ ـ یہ حدیث اصل میں یوں ہے : السعید و من ہو سعیدہ فی بطن آمہ والشقی من شقی فی بطن آمہ ـ
۲ ـ واقعات انیس میں "مکتسبی" لکھا ہے ـ
۳ ـ "فرمودند" ہونا چاہیے ـ
۴ ـ مائی کرو فلم میں "ما کشتہ چشم سرمہ سائیم" لکھا ہے جو درست نہیں ـ
۵ ـ ہمراہ این رباعی بود ؟ یا باین طور بود ؟
۶ ـ "مائی کرو فلم اور بیاض فائق میں "عن" لکھا ہے لیکن واقعات انیس میں "عن" موجود نہیں ـ

حبیب اللہ برادر زادۂ [شاہ[1]] سجن قدس اللہ سرہ کہ درویش معروف اند ، و میر ابراہیم نور اللہ مضجعہ برادر ایشان نیز مشہور ، صحبت گزیدم - زاد ہاے طبع خود را می نمودم ، اگرچہ سید مسطور موزوں ندارند لیکن سلمہ‌اللہ تعالیٰ در فہمیدن ممتاز سنجیدگانند - و بزرگان فہمیدن شعر را بہ از گفتن جائز داشتہ اند کہ گفتہ اند :

شعر گفتن گر چہ دُر سُفتن بود
بسکہ فہمیدن بہ از گفتن بود

روزے بفرمائش آن شفیق ریختہ انشا کردم کہ در فصاحت زبان دانان ہند فصیح آمد ، ازان باز چون زبان خود گفت[2] از فارسی گذشتہ آنچہ بدل آمد گفتم ، لیکن اصلاح حروف و معنی (کذا) بخدمت میر صاحب ، ضیائے بزم سخندانان بزم آتش زن کانون سوختہ درونان ، میر ضیاء الدین حسین ادام افضالہ کہ [ضیاء] تخلص دارند ، گرفتم ، لیکن طرز سخن ایشان گاھے از من سر انجام نیافتہ ، بر قدم دیگر بزرگان ، مثال حضرت خواجہ میر درد صاحب ، کہ درد مندی و بزرگی‌ہائے اوشان عالم گیر است ، از کلام درد اوشان جگر عالمے فیض رسان درد و ذات با برکات اوشان میان درویشان [چون] فرید فرد - دیگر صاحب وقت (کذا) رفیع منزلت میرزا محمد رفیع [سودا] سلمہ اللہ تعالے [کہ از رائے صائب زیادہ ناطق اند] نظیر نظیری و جان قدسی اشعار اوشان ست [میر] میر محمد تقی، ہمشیر زادۂ شیخ سراج‌الدین خان آرزو کہ سراج محفل شعراء بودہ و از صرصر زمانہ خاموش گردیدہ نور اللہ مرقدہ کہ تخلص [میر] دارند [و] بابا فغانی را در نالۂ خود زیر می خوانند و صیت فطرت اوشان طنطنہ در جہان افگندہ [و] دیگرے بخیال خود قائم نکردم کہ وضع آن را پسندم و دل بگفتار آن (ھا) بربندم - حق تعالے ایں ہر سہ را چون موالید ثلاثہ تا جہاں ست قائم دارد - و من شعرہائے آبدار کہ بہ ہزار جانکنی جمع نمودہ ام ، آتشے کہ بہ کلبۂ فقیر

---

۱ - مائی کرو فلم میں یہ لفظ نہیں ہے -

۲ - یہ فقرہ اُلجھا ہوا ہے مطلب نہیں کھلتا - در زبان خود گفتم ؟ او گفت در زبان خود گو ؟

افتاد سراپا سوختہ مگر بر زبانِ محباں کہ باقی بود ازاں بار دیگر گرد آوردہ - پس آنچہ آنچہ طبع زادہ معروف نمودہ¹ توقع از صاحبان معنی دارم کہ ہر گاہ بر نسبتے (کذا) معانی (صفحہ ۲۳۵) و الفاظ نگاہ کنند از بلندئ حوصلۂ خود قلم رو (بر او ؟) بکشند اگر توفیق باشد (در ؟) اصلاح² آں کوشند کہ در مذلت (منزلت ؟) بزرگاں دین سعی ہا نمودہ اند و سخن نکردہ و ما (تو) فیقی الا باللہ (علیہ) توکل واللہ (الیہ ؟) مآب³ -

(۴)

دیباچۂ سحرالبیان پہلی دفعہ سنہ ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا اور سحرالبیان کے شروع کے بعض ایڈیشنوں میں چھپتا رہا اورینٹل کالج میگزین اگست سنہ ۱۹۲۶ء کے پرچے میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے ایک قلمی نسخے سے اس کا خاصا حصہ شائع کر دیا (ص ۱ تا ص ۷) پھر سید احمد اللہ قادری صاحب نے ۲۷ رمضان سنہ ۱۳۵۲ھ میں شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن سے مثنوی رموز العارفین کے ساتھ اسے شائع کیا - مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے مثنویات میر حسن⁴ کے ساتھ بھی اسے طبع کیا - اتنی بار شائع ہونے کے بعد اسے پھر شائع کرنے کا کوئی موقع نہ تھا - لیکن برٹش میوزیم کے نسخے کے مائی کرو فلم کو بغور دیکھنے پر معلوم ہوا ہے یہ مطبوعہ متن سے بعض جگہ مختلف ہے اور کچھ عجب نہیں جو مصنف کے اولین مسودے کی نقل ہو - اختلافات کو

---

۱ - اعنی : زادۂ طبع را معروف نمودہ -

۲ - متن میں صلاح لکھا تھا -

۳ - متن میں جو جملے یا الفاظ بڑی خطوط وحدانیوں میں ہیں وہ بیاض فائق ، واقعات انیس اور مرزا علی حسن کے مرتبہ دیوان کے اقتباسات سے لیے گئے ہیں - چھوٹی خطوط وحدانیوں کی عبارتیں قیاسی تصحیحات ہیں عربی عبارتوں کے اعراب قرآن پاک کی مدد سے لگائے گئے ہیں - جمل عربی کی تصحیح کے لیے مرتب جناب عبدالحی صدیقی کا ممنون ہے -

۴ - نولکشور پریس طبع سنہ ۱۹۴۴ء ص ۱۳ تا ص ۲۰ -

آسی کے ایڈیشن سے فٹ نوٹوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دیباچہ نگار شیر علی افسوس میر علی مظفر داروغۂ توپ خانۂ میر قاسم (ناظم بنگال) کے لڑکے تھے[۱]۔ ۱۱۵۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے عمدۃ الملک امیر خان انجام کی شہادت کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاش معاش میں نکلے تو افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی[۲]۔ افسوس دلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد انجام کی سرکار میں تھے۔ میر مظفر کو "نواب خان عالم بقا اللہ خان مرحوم نے لکھنؤ میں بلوایا اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے کے واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا"[۳]۔ شجاع الدولہ کا قیام لکھنؤ سنہ ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۷۸ھ تک رہا اس کے بعد انھوں نے فیض آباد کو دارالحکومت کر لیا تھا۔ "بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خان کے بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خان صوبہ دار بنگالہ کے تھے سید مظفر علی خان (پدر افسوس) وارد مرشد آباد ہوئے اور داروغگیٔ توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے ... غرض جب وزیرالممالک نواب شجاع الدولہ بہادر مع صوبیدار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہوئے تو سید مظفر علی خان بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خان کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انھوں نے نہیں کیا بلکہ لکھنؤ چلے آئے اور بعد کئی برس کے حیدرآباد کی طرف گئے"[۴]۔ میر جعفر ۲۸ جون سنہ ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ کی جگہ نواب بنگال ہوئے (شوال سنہ ۱۱۷۰ھ) ان کی نوابی کا زمانہ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۴ھ تک ہے۔ گویا مظفر علی خان ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور سے قبل لیکن ۱۱۶۷ھ کے بعد لکھنؤ پہونچ چکے تھے اور چند سال وہاں رہ کر ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۴ء سے قبل ہی مرشد آباد پہونچ چکے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور میں میر قاسم ناظم بنگال ہوئے تو یہ ان کے ساتھ

---

۱ - تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲۱ -

۲ - ارباب نثر اردو، سید محمد قادری، انجام ۲۳ ذالحجہ سنہ ۱۱۵۹ھ کو شہید ہوئے -

۳ - گلشن ہند، ص ۵۷ -

۴ - گلشن ہند، ص ۵۷ -

تھے - بکسر کی لڑائی میں (۲۳ اکتوبر سنہ ۱۷۶۴ء=۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۸ھ) یہ میر قاسم کی طرف سے شریک تھے - میر جعفر کو انگریزوں نے اپنی طرف سے ۷ جولائی سنہ ۱۷۶۳ء کو بنگال کا ناظم بنا دیا - لڑائی کے ساڑھے تین ماہ بعد ۱۳ شعبان روز سہ شنبہ سنہ ۱۱۷۸ھ کو میر جعفر فوت ہوگئے (۵ فروری) نجم الدولہ غالباً ذالحجہ سنہ ۱۱۷۹ھ میں اور سیف الدولہ اواخر سنہ ۱۱۸۳ھ میں فوت ہوئے - بکسر کی لڑائی کے بعد اودھ پر انگریزی قبضہ ہوا - ۱۶ اگست سنہ ۱۷۶۵ء الہ آباد میں شجاع الدولہ سے انگریزوں کا معاہدہ ہوا تو یہ علاقہ انہیں واپس ملا - شجاع الدولہ (سنہ ۱۱۷۹ھ) اسی سال لکھنؤ آیا اور پھر فیض آباد کو دارالحکومت قرار دے دیا - بظاہر افسوس کے والد کو بھی سنہ ۱۱۷۹ھ میں لکھنؤ آنا چاہیے اور شجاع الدولہ کے ساتھ ہی وہاں سے فیض آباد گئے ہوں گے - افسوس نے سنہ ۱۱۸۹ھ میں سالار جنگ برادر نسبتیٔ شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی اور دس سال تک اس کے بیٹے میر نوازش علی سردار جنگ کے زمرۂ مصاحبین میں رہے (ملاحظہ ہو دیباچہ سحرالبیان) میر حسن سے دس سال تک ان کا ساتھ رہا - سنہ ۱۱۸۹ھ یا سنہ ۱۱۹۰ھ میں جب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو سالار جنگ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ میں آٹھ آئے تھے۔ میر حسن اور افسوس دونوں ان کے متوسلین میں تھے - ظاہر ہے یہ بھی لکھنؤ آ گئے ہوں گے، لیکن افسوس کی گذر اوقات لکھنؤ میں مشکل سے ہوتی تھی - سنہ ۱۱۹۴ھ میں صاحب مسرت افزا لکھتے ہیں :

''افسوس کہ از چندے فلک پلنگ فطرت بروباہ بازی او را در شاخ گوزن افلاس آویختہ و بناخن کینہ جوئی رشتۂ اقتدارش گسیختہ اکنون در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد''[1] -

۵ جمادی الاخر سنہ ۱۱۹۸ھ میں جہاندار شاہ لکھنؤ پہنچے - سنہ ۱۱۹۹ھ میں افسوس ان کی سرکار میں ملازم ہوگئے اور بنارس چلے گئے (ملاحظہ ہو دیباچہ سحرالبیان) ''جن ایام میں نیر اوج شہر یاری (جہاندار

۱ - ص ۲۴، ۲۵ -

شاہ) کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا اور کوچ شاہجہان آباد کو ہوا تو میر مذکور (افسوس) بہ سبب بعضے عوارض کے رہ گئے اور ساتھ نہ جا سکے"[1]۔ جہاندار شاہ سنہ ۱۲۰۱ھ میں دلی گئے تھے ۔ ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۱ھ میں اکبر آباد میں تھے ۔ ۱۵ رجب کو فرخ آباد کے راستے سے لکھنؤ آئے[2] اور پھر بنارس پہونچے ہوں گے جہاں انھوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ میں وفات پائی (قاموس المشاہیر ترجمہ جہاندار شاہ) ۔ سر جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے کہ ۲۱ مئی سنہ ۱۷۸۸ء (۲۴ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ) کو وفات پائی[3] ۔ افسوس سنہ ۱۲۰۱ھ کے اوائل میں (لیکن وفات میر حسن کے بعد) لکھنؤ آئے ہوں گے ۔ بعد میں مرزا فخرالدین احمد خاں کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں نوکر ہوئے[4] ۔ کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد میں افسوس مرزا علی لطف (صاحب گلشن ہند) سے بھی ملے تھے ۔ افسوس نے کلکتے میں سنہ ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی مندرجہ ذیل دیباچہ سحر البیان سے میر حسن اور افسوس دونوں کے حالات اور تعلقات پر روشنی پڑتی ہے ۔

(۵)

(دیباچۂ سحرالبیان)

(شیر علی افسوس)

حمد کی لیاقت آسی صانع کو ہے جس نے عناصر اربع[5] کوکہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اپنی قدرت کاملہ سے ربط دے کر ارکان ٹھہرایا اور کیفیت متوسط پر مرکبات کے اجسام کو بنایا ، لیکن انسان کو ہر مخلوق سے شریف تر اور لطیف تر خلق کیا کہ نفس ناطقہ نے علاقہ آسی

---

۱ ۔ گلشن ہند ، ص ۵۷ ۔

۲ ۔ تاریخ اودھ ، نجم الغنی ، جلد سوم ، ص ۲٦٦ ۔

۳ ۔ Later Mughals ، جلد چہارم ، ص ۲۲۵ ۔

۴ ۔ دستور الفصاحت ۔ احد علی یکتا ، ص ۱۰۲ ، ۱۰۳ نیز آرائش محفل ، افسوس ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، طبع اول ، ص ۵ ۔

۵ ۔ آسی کے ایڈیشن میں "اربعہ" ۔

سے پکڑا اور وہی کلیات و جزئیات کی حقیقت سے ماہر ہوا - یہاں تک کہ تعلیم و تعلم کا سلیقہ آسے بخوبی آ گیا اور آس کی زبان میں بھی استعداد ہر لغت کے تلفظ کی بخشی - چنانچہ آس نے جس بولی کو چاہا سیکھ لیا بلکہ سکھا دیا - پس لازم ہے کہ اس شکر میں ہر دم اپنی زبان گویا رکھے اور آس کی حمد کو ہر حال میں اپنا ورد کرے - مثنوی[1] :

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول
کہ یاد اس کی ہے دونوں جگ کا حصول

آسی کو مددگار اپنا سمجھ
آسی کو فقط یار اپنا سمجھ

برے وقت میں کوئی آس کے سوا
ترے کام آوے یہ امکاں کیا

محبت سے سب کے اٹھا اپنا دل
فقط آس سے ہی بس لگا اپنا دل

زباں تیری گویا رہے جب تلک
اور امکاں سخن کا رہے جب تلک

کیا کر ثنائے جہاں آفریں
سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں

جو بعد اس کے منظور ہو کوئی بات
تو کہہ نعت احمد[2] شہ کائنات

فی الواقع ستودۂ خدا سب انبیاء و اولیاء ہیں ، تعریف آن کی موافق مقدور ہر ایک کو ضرور ہے ، خصوصاً نعت و منقبت خاتم المرسلین اور آس کے وصی امیر المومنین علیہما السلام کی کیونکہ انھوں ہی نے دنیا میں ہم کو راہ ہدایت کی بتلائی کہ ہم نے منزل ایمان کی سہولت پائی ، عاقبت

---

۱ - آسی : یہ لفظ نہیں ہے -

میں بھی اُمید شفاعت کی اور تعائے جنت کی انھیں سے رکھتے ہیں ۔ مثنوی[1] ہے:

بھروسہ کسی کا نہیں اک ذرا
ہے آن کا ہی ہم کو فقط آسرا

نبی[2] و علی[3] اپنے ہیں پیشوا
نبی[2] و علی[3] اپنے ہیں رہنما

انھیں سے ہے کونین میں مجھ کو کام
وے مولا ہیں میرے میں آن کا غلام

درود آن پر اور آن کی اولاد پر
بدل بھیجتا ہوں میں شام و سحر

بعد اس حمد و نعت کے مثنوی سحر البیان اسم با مسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لبھانے کو موہنی منتر ہے اور[2] داستان اس کی سحر سامری کا دفتر ، جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طباع کو مقبول و مرغوب ہوتی ہے ، راست ہے کہ اس کا انداز سراپا اعجاز ہے ، اور وہ ہر ایک صاحب طبیعت کے دم ساز ، تعریف اس کی جہاں تک کیجے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے[3] صلے کا اس کے ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر[4]

---

۱ - یہ لفظ آسی کے ہاں نہیں ہے ۔
۲ - آسی : "اور" کے بعد "ہر" ۔
۳ - آسی کے یہاں یہ فقرے بھی ہیں : احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اس کی بندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں ۔ اس لیے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بہ قلت شمار میں نہیں آتا اور تعرض اس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا ۔ بقول شخصے :

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

۴ - آسی : "بہادر" نہیں لکھا ۔

مرحوم نے ایک دو شالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچہ[1] میں سے نکلوا کر مصنف[2] عنایت کیا ۔ رتبہ تو اُس کا البتہ بڑھا پہ دل گھٹ گیا ، اس لیے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا ؛ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے کیونکہ مال کھرا ، خریدار اتنا بڑا ، اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا ، بلکہ گھاٹا آیا[3] مصنف سحرالبیان[4] میر حسن[5] خلف میر غلام حسین صاحب ؟ (ضاحک)[6] ۔

| وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات اور دادا اُس عالی قدر کا فاضل متبحر اور فقیہ بے مثال تھا اور باپ کو فضیلت تھی لیکن فارسی کی استعداد خوب ہے بلکہ شعر بھی رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ رباعی طبع زاد اُس کی راقم نے اُس کی زبانی سنی ہے ۔ رباعی[7] | :

فریاد دلا کہ غم گساراں رفتند
سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند

---

۱ - دست بقچے ۔

۲ - کو ۔

۳ - آسی : "یہ چند سطریں مصنف کے حسب و نسب اور احوال میں ہیں"۔

۴ - "اس کا" "سحر البیان" کی جگہ ۔

۵ - اضافہ : "دہلوی متخلص بہ حسن"۔

۶ - اضافہ "ضاحک کا"۔

۷ - اس پیرے کی جگہ آسی نے مندرجہ ذیل عبارت دی ہے : "وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات ، گردش فلکی سے انھوں نے شہر مذکور کو چھوڑا اور دلی میں آ کر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا ۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا بلکہ سن تمیز کو پہنچا ۔ دادا اس عالی قدر کا سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا ؛ لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی مگر طالب علمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا ، پر فارسی میں استعداد اچھی تھی ؛ بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ یہ رباعی طبع زاد اس کی راقم نے اُس کی زبانی سنی ہے" :

چو بوئے گل آمدند بر باد سوار
در خاک چو قطرہ ہائے باراں رفتند

قصیدہ بھی ایک اور[1] اسی مغفور کا تہ دار[2] دیکھا ہے۔ لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرعوب تھا۔ غزل کہنی ترک کی تھی، قیامت ہنسوڑ اور ٹھٹھول تھا، تخلص آس کا اس پر دال ہے۔ بر ظاہر نہایت ثقہ اور متشرع، اکثر عامہ سبز سر پر باندھتا تھا اور جامہ کم گھیر امل پتی کا گلے میں، ڈاڑھی متوسط لبیں لی ہوئیں[3]، قد میانہ گندم گوں لیکن میر حسن ڈاڑھی منڈواتے تھے پر جامہ نیمہ ان کا بھی ویسا ہی تھا اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستان زادوں کی سی۔ قد لمبا تھا اور رنگ گندمی، ہر چند وضع تو ایسی تھی پر شوخ مزاج و لطیفہ گو[4] بھی تھے[5]۔

سوائے اس کے بردباری اور ملنساری آن کی خلقت میں تھی، کسی کو میں نے اس عزیز سے شاکی نہیں دیکھا[6] طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی۔ شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا، خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید شاہجہان آباد میں اکثر[7] لڑکائی کے بیچ ہوا ہے اور بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ اودھ میں آیا، سکونت فیض آباد کی اختیار کی، علاقہ روزگار کا نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہنچایا۔ مرزا صاحب[8] مرزا نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ دام ثروتہ کا ہوا، مرزائے موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے، خدا آسے

---

۱ - اور کی جگہ ''آدھ''۔
۲ - ''تہ دار'' کی جگہ ''رتبہ وار''۔
۳ - ''لی ہوئیں'' کی جگہ ''لی ہوئی''۔
۴ - اضافہ ''وے''۔
۵ - اضافہ: ''ہزال و فحاش''۔
۶ - ''دیکھا'' کی جگہ ''پایا، اور بیزار نہیں دیکھا''۔
۷ - ''اکثر'' نہیں ہے۔
۸ - مرزا صاحب کی جگہ ''مصاحب'' (برٹش میوزیم کے نسخے میں ممکن ہے کاتب کی غلطی ہو)۔

سلامت[١] کہ اشعار فارسی[٢] سے اُسے رغبت اور شعر کی اُسے[٣] محبت ہے ، چنانچہ میر مذکور کو بھی اُس نے اپنا جلیس و انیس[٤] کیا تھا اور وہ تھا بھی اسی لائق ، اگرچہ علم مہیا[٥] نہ تھا بلکہ[٦] فارسیت تھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی[٧] کہہ[٨] لیتا تھا ؛ لیکن علم مجلس میں بے بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا ۔ مشق سخن اُس نے اسی ملک میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے ، کہ ہم مشق مرزا سودا اور میر تقی میر کے تھے ، کی تھی | لیکن میدان سخن میں ان صاحبوں سے توسن طبع کو بڑھا لے گیا[٩] | غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے ۔ غزل ، رباعی ، مثنوی ، مرثیہ میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا ہے ، بلکہ سوائے قصیدے کے ہر قسم کی نظم پر قادر تھا ، سچ تو یہ کہ ادا بندی کا حق اُن نے خوب ادا کیا اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا | کہ بیان اس کا کیا نہیں جاتا[١٠] | خدایش بیامرزاد | حلیہ ہائے بہشت عطا کند[١١] | راقم کو اُس سے دوستی دلی تھی کبھی[١٢] خفگی و رنجش[١٣] باہم نہیں ہوئی ، حالانکہ اُسی سرکار میں میں بھی نوکر اور

---

١ - اضافہ : رکھے ۔

٢ - "فارسی" نہیں ہے ۔

٣ - "شعر کے اُسے" کی جگہ "شعرا سے" ۔

٤ - "انیس و جلیس" ۔

٥ - "مہیا" کی جگہ یہ عبارت ہے "عربی اُسے مطابق" ۔

٦ - "بلکہ" کی جگہ "ہاں" ۔

٧ - اضافہ : "کبھو" ۔

٨ - اضافہ : بھی ۔

٩ - اس فقرے کی جگہ مندرجہ ذیل عبارت : "سوائے ان کے مرزائے مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح لی تھی ، چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے" ۔

١٠ - اس فقرے کی جگہ صرف "رکھا" ۔

١١ - یہ فقرہ بھی نہیں ہے ۔

١٢ - "کبھو"

١٣ - "رنجش خفگی"

آسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا ، دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے بلکہ اکثر آپس میں غزلیں[1] طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں ، لیکن نہ بطوراستفادہ کے جتنا[2] کہ[3] علی ابراہیم خاں مرحوم[4] نے بے تحقیق اپنے تذکرے میں لکھا ہے ، صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے ، اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا ۔ ہر گاہ حقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے ، باوجود اس کے کہ شاعری آن کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی ۔ پھر کس لیے اس بات سے انکار کرتا ۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں ، لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار نہیں | کیا جاتا ہے[5] |

آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا ۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا ، میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا ۔ بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذالحجہ | سنہ بارہ سے میں مرض الموت لا حق ہوا بدان (کذا) ماہ محرم کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے کہ بتاریخ پانچویں ماہ محرم کے اس دار فانی سے آس سرائے جاودانی کو کوچ کیا[6] | اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج بیچ مرزا قاسم علی خان بہادر دام ظلہ کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا ۔ خدائے کریم اس کو یہاں دارالسلام عطا کرے اور وہاں قصر جنت بخشے :

عدم سے مسافر جو آیا یہاں
مقرر وہ ایک روز جاوے گا وہاں

---

۱ ۔ اضافہ : ہم
۲ ۔ ''جیسا''
۳ ۔ اضافہ : ''نواب''
۴ ۔ ''مرحوم'' کی جگہ ''مغفور''
۵ ۔ ''ہو سکتا''
۶ ۔ اس فقرے کی جگہ : ''سنہ بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا ، ندان غرۂ محرم کو کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے اس دار فانی سے آس سرائے جاودانی کو کوچ کیا''

رہے جگ میں ہر چند وہ ہر کہیں
پر اُس کا ٹھکانا ہے زیر زمیں

نہ غفلت میں اپنی تو اوقات کھو
ارے بے خبر جاگتے میں نہ سو

جہاں میں تو مہماں ہے چند روز
ترے جسم میں جاں ہے چند روز

یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام
کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

فی الواقع نیک نامی بھی عجیب چیز ہے ، انسان کا نام اسی سے زندہ رہتا ہے ، یا کلام و اولاد سے ، سو وہ خوش نصیب ہی (کذا)[1] | دونوں اس سمت (کذا)[2] | چھوڑ گیا ، چار بیٹے فضل الہی سے اس کے اب تک موجود ہیں ، تین شاعر ہوئے ، کہ بود و باش انھوں نے فیض آباد میں اختیار کی۔ معاش نوکری پر ہے ، چنانچہ میر مستحسن خلیق تخلص اور میر محسن محسن تخلص ، مرزا تقی بھو بیگم صاحب مادر آصف الدولہ مد ظلہا کے داماد کے رفیق ہیں اور میر احسن[3] خلق تخلص داراب علی خان ناظر کے ساتھ ہیں[4]۔ یہ اور خلیق دونوں صاحب دیوان ہیں ، شعر اپنے باپ ہی کے انداز پر کہتے ہیں ، لیکن خلیق کا سرشتہ اصلاح کا مصحفی سلمہ اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ خدا[5] انھیں سلامت رکھے یہ[6] چند فقرے بطور دیباچہ زبدۂ دوستان[7] عالی

---

۱ - "بیٹے" (اور یہی صحیح ہے)
۲ - "دونوں اُس سمیت" (یہی درست ہے)
۳ - "میر حسن خلق" (یہ درست نہیں۔ صحیح وہی ہے جو اوپر مذکور ہے)
۴ - "ہیں" کی جگہ "ہے"
۵ - اضافہ : "آسے اور"
۶ - "یے"
۷ - "دوستان" کی جگہ "نوینان"

شان[1] مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی لاڈ[2] گورنر بہادر دام اقبالہ کے عہد میں[3] ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کے ہیں، حسب الارشاد صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ صاحب[4] بہادر مدرس ہندی دام دولتہ کے اس عاصی نے لکھے اور ان کو اس مثنوی کا مضیمہ (کذا)[5]، کیا، | واللہ الی التوفیق[6]، | تمام شد[7]۔

---

۱ - اضافہ "مظہر"

۲ - "لارڈ"

۳ - اضافہ : "کہ"

۴ - "صاحب" ندارد

۵ - ضمیمہ (اور یہی صحیح ہے) - نسخہ برٹش میوزیم میں کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے -

۶ - آسی کے ہاں یہ عبارت نہیں ہے -

۷ - تمام شد کے بعد آسی کے ہاں : "دیباچہ میر شیر علی افسوس"

سحرالبیان کا ایک نادر قلمی نسخہ

(۱)

میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کے لاتعداد قلمی نسخے دنیا کی معلومہ لائبریریوں میں بکھرے پڑے ہیں[1] - ذاتی کتاب خانوں میں بھی اس کے بے شمار نسخے پائے جاتے ہیں - سنہ تکمیل (۱۱۹۹ھ) سے لے کر اب تک اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے - کئی کتاب خانوں میں مثنوی کے مصور نسخے بھی ملتے ہیں[2] - بعض کاتبوں نے اعراب لگا کر بھی نسخے ترتیب دیے[3] - اس کی نوبت بھی آئی کہ ساری مثنوی کا خمسہ کیا گیا[4] - مثنوی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ڈرامے کی شکل میں بھی اسے ڈھالا گیا[5] - مثنوی کی شہرت نے اسے افسانوں اور طلسمی قوتوں کا

۱ - ترپن (۵۳) قلمی نسخوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ مثنویات میر حسن جلد اول مرتبہ راقم الحروف ، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور -

۲ - تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب میر حسن اور ان کا زمانہ متعلقہ صفحات - تین نسخے حیدرآباد کے عجائب گھر میں ہیں جن میں دبستان دکن کی تصاویر ہیں (نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۵ء ، صفحہ ۴۴) کتاب خانہ سالار جنگ میں کئی مصور نسخے ہیں (فہرست کتاب خانہ مرتبہ نصیرالدین ہاشمی) -

۳ - کم از کم دو نسخوں کا علم ہے : ایک علی گڑھ اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں -

۴ - خمسہ باطن نومبر ۱۸۹۲ء -

۵ - اس قصے کو سات مصنفین نے اردو ڈرامے کے طور پر لکھا - تفصیل کے لیے دیکھیے ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) صفحہ ۳۵۲ -

حاصل بھی بنا دیا ، اور عوام میں اس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات مشہور ہوئے ؛ مثلاً یہ عقیدہ کہ جہاں سحرالبیان زیادہ پڑھی جائے گی وہاں تفرقہ ضرور پیدا ہوگا ، یا یہ کہ جس گھر میں اس کا ورد ہوگا اس خاندان پر ضرور بپتا پڑے گی - سعادت خاں ناصر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سحرالبیان سے ''ہزار ہا عورات فاحشہ ہوگئیں'' - افسانہ طرازی کی اس فضا میں سحرالبیان کے لاتعداد نسخے رقم ہوئے اور شہر شہر گاؤں گاؤں اس کی شہرت ہوئی ، اب تک ہزاروں کی تعداد میں مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے - اس وقت تک راقم الحروف کو اس کی ۴۸ اشاعتوں کا حال معلوم ہے[1] - جو کتاب اس کثرت سے قلمی صورت میں اور اس کے بعد مختلف اشاعتوں کے مرحلے سے گزری ہو اس کے متن میں بعض جزئی اختلافات کا پیدا ہو جانا عین ممکن ہے - مثنوی کے مستند اور غیر مستند نسخے کثرت سے ملتے ہیں - اس لیے متن کی تصحیح میں مرتبین کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے -

(۲)

اب تک جو مطبوعہ نسخے دیکھنے میں آئے اور جن کا متن بہت حد تک صحیح اور قابل اعتنا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) فورٹ ولیم کالج کا نسخہ ۱۸۰۳ء (مرتبہ میر شیر علی افسوس)

(۲) مطبع جعفری بمبئی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء -

(۳) مخزن پریس دہلی کا نسخہ ۱۹۰۸ء

(۴) نولکشور کا نسخہ مرتبہ آسی ۱۹۳۵ء

(۵) شمس بریلوی کا مرتبہ نسخہ ۱۹۶۷ء

ان میں فورٹ ولیم کی اشاعت قدیم اور قابل اعتماد ہے ، اس کے بعد آسی اور شمس بریلوی کے نسخوں کا نمبر آتا ہے - مخزن پریس کا نسخہ صحت متن کے اعتبار سے ان کے بعد ہے - ان نسخوں کے مرتبین نے اپنے متون

---

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ مثنویات میر حسن (جلد اول) مرتبہ راقم الحروف -

ایک سے زائد قلمی نسخوں پر منحصر کیے ہیں اور اس میں بھی قدیم تر نسخوں کو چھانٹ کر بنیاد بنایا ہے ۔ لیکن اب بھی معاصر اور قریب العہد نسخوں کی مدد سے متن کی ترتیب ممکن ہے ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نسخے قدیم ترین قرار دیے جا سکتے ہیں :

(۱) ۱۱۹۹ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانۂ انجمن ترقی اردو کراچی[1]

(۲) ۱۲۰۸ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانۂ نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن[2]

(۳) ۱۲۰۹ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانۂ انجمن ترقی اردو کراچی[3]

لیکن سحرالبیان کے ایک قلمی نسخے کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ قدیم اور راقم کی رائے میں میر حسن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اس پر میر حسن کے دستخط نہیں ہیں اور ہمارے پاس حسن کی تحریر کا کوئی دوسرا نمونہ بھی نہیں ہے جس سے ان کے خط کا اندازہ کیا جا سکے ۔ اشپرنگر کی اودھ کٹالاگ میں دیوان حسن کے ایک نسخے کا حال درج ہے جس پر تحریر مصنف کا گمان ہو سکتا ہے ۔ موتی محل (لکھنؤ) کی لائبریری میں دیوان حسن کے دو نسخے موجود تھے جن کا حال اشپرنگر نے دیا ہے ۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ اندراج ملتا ہے :

An other copy in the same collection, without preface, written in a bad hand, with many erasures and corrections, is apparently an autograph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand :

---

۱ ۔ بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام راقم ۲۲ اکتوبر ۱۹۵٦ء۔

۲ ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتبہ نصیرالدین ہاشمی صفحہ ۲۵٦ نسخہ نمبر ۸۳٦ ، اس میں ۱٦ تصاویر دکن اسکول مصوری کی شامل ہیں ۔

۳ ۔ مکتوب ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام راقم ۲۲ اکتوبر ۱۹۵٦ء ۔

۲۵ ذوالحجہ پنج شنبہ ۱۱۹۲ھ در بنگلہ[1]

آج یہ نسخہ اگر مل سکتا تو سحرالبیان کے خط اور اس دیوان کی تحریر کے باہمی مقابلے سے ہم حسن کی تحریر کے بارے میں زیادہ یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکتے ؛ تاہم سحرالبیان کے اس نسخے کا بغور مطالعہ اور بعض دوسری شہادتوں سے یہ نسخہ میر حسن کے اپنے ہاتھ ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

(۳)

نسخے کی پیشانی پر "قصہ فیروز شاہ قلمی" لکھا ہوا ہے ۔ اس تحریر اور مثنوی کے متن کی تحریر میں فرق ہے ۔ نسخہ کرم خوردہ ہے ، مثنوی کے اکثر اشعار اس سے بری طرح متاثر ہیں ۔ جلد کے گتے کاغذ کے ٹکڑے آپس میں جوڑ کر تیار کیے گئے ہیں ۔ ان کاغذوں کو اگر کسی طرح الگ کر کے دیکھا جا سکے تو قدیم تحریر کے بعض نمونے ضرور ہاتھ لگیں گے ۔ جلد کے اندر کے رخ کاغذ کی بعض عبارات خوانا ہیں اور ان پر ۱۰ شوال ۱۲۳۳ھ کی تاریخ درج ہے ۔ یہ ورق گھر کے روزانہ حسابات کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں اور مثنوی کے کاتب سے جداگانہ شخص کی تحریر ہیں ۔ جلد کے اندرونی رخ کے اس صفحے پر ایک نام "انور خاں" بھی لکھا ہے جو گوشوارے کے تحریر کنندہ سے مختلف ہے اور نسخے کی پیشانی کی عبارت (قصہ فیروز شاہ قلمی) سے ملتا جلتا ہے ۔

اس نسخے میں چار مثنویاں ہیں : سحرالبیان ، مثنوی لال و گوہر ، قصہ سوداگران ، قصہ پٹھان اور باہمنی ۔ سحرالبیان ورق ۲ الف تا ۶۳ الف ، مثنوی لال و گوہر ۶۳ ب تا ۸۳ ب ، قصہ سوداگران ۸۴ الف تا ۸۷ الف قصہ پٹھان و باہمنی ۸۷ ب تا ۹۲ الف پھیلی ہوئی ہیں ۔ تحریر کے دوائر پختہ ہیں ۔ ابتداء میں جہاں سنبھل کر لکھا ہے تحریر نستعلیق مائل بہ شکستہ ہے ، آگے چل کر بعض مقامات پر پوری طرح شکستہ ہو گئی ہے ۔ پہلی دو مثنویاں ایک ہاتھ کی ، دوسری دو دوسرے ہاتھ کی نقل کردہ معلوم ہوتی ہیں ۔ قصہ سوداگران کا آخری حصہ آسانی سے پڑھا بھی نہیں جا سکتا ۔ سحرالبیان کے متن اور باقی مثنویوں میں ایک فرق نمایاں ہے ۔ سحرالبیان کے

[1] ۔ اودھ کٹالاگ (اشپرنگر) صفحہ ۶۰۹ عدد ۶۲۵ دیوان حسن ۔ H—P

بیش تر شعر کاٹ چھانٹ اور ترمیم و اضافے کی زد میں ہیں لیکن باقی تینوں مثنویاں اس عمل سے خالی ہیں ۔ ایک دو مقامات کے سوا جہاں روانیٔ تحریر میں کاتب کوئی مصرعہ صریحاً غلط نقل کر گیا ہے یا لکھتے ہوئے بے احتیاطی سے پہلی سطر کا کوئی حصہ یا پورا مصرعہ دوسری سطر کے محاذ میں لکھ گیا ہے تو اسے کاٹ کر اصل مصرعہ لکھ دیا ہے ، ورنہ مؤخر الذکر مثنویوں میں کسی جگہ کوئی رد و بدل یا حک و اصلاح نہیں ہے ، لکھنے والے نے کسی جگہ اپنے دستخط نہیں کیے اور نہ مسودات پر دستخطوں کا رواج کسی زمانے میں بھی رہا ہے ۔ سحرالبیان کا متن میری دانست میں میر حسن کا ذاتی مسودہ ہے جس پر مصنف نے خود ہی ترمیم و اصلاح کی ہے ۔

(۳)

اس متن کے تحریر مصنف ہونے کے قوی داخلی شواہد پائے جاتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں میں اسے مصنف کا خود نوشت مسودہ قرار دینے پر مجبور ہوں :

(الف) اس متن کے مرتب نے بعض اشعار متن سے خارج کر دیے ہیں اور وہ اشعار اب متداول نسخوں میں نہیں ملتے ۔

(ب) بعض اشعار کی بندشیں اور ترکیبیں بدل کر چست کر دی گئی ہیں اور اب یہ اشعار اس آخری شکل میں ہی مروجہ نسخوں میں درج ہیں ۔

(ج) بعض اشعار کے قوافی بدل دیے گئے ہیں اور آخری صورت مؤخر نسخوں اور طباعتوں میں پائی جاتی ہے ۔

(د) بعض مقامات پر اشعار حاشیے میں بڑھائے گئے ہیں کبھی سات کا ہندسہ بنا کر (۷) اور کبھی خط کھینچ کر ، ان اشعار کو داخل متن شمار کیا گیا ہے ۔ عام نسخوں میں یہ اشعار انہی مقامات پر شریک متن ہیں ۔

(ہ) اشعار میں بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اس ترقی یافتہ صورت میں یہ اشعار عام نسخوں میں ملتے ہیں ۔

(و) اشعار میں ایسی کاٹ چھانٹ ہے جو عموماً خود مصنف کرتا ہے۔

(ز) اشعار کے آدھے آدھے مصرعے لکھ کر خیال کی رو بدل جائے پر مصرعوں کا تحریر شدہ حصہ یا اس کا کوئی جز بدل دیا ہے اور شعر کا رخ اور طرف موڑ دیا ہے۔

(۵)

اب اس اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

(الف)

مثنوی کے اس نسخے میں بعض ایسے اشعار ہیں جو متداول نسخوں میں نہیں پائے جاتے - ذیل میں منقبت امیرالمومنین کے سلسلے سے قبل کے چند شعر دیے جاتے ہیں:

الٰہی بصدق ابابکر خاص   کہ بودش بہ محبوب [تو] اختصاص

الٰہی بگرداں بعدل عمر   درخت امید مرا بارور

الٰہی بعثان شہ شرمگیں   نگہدار شرمم بدنیا و دیں

الٰہی بعلم و [بہ] نور علی   درو چشم کن در جہاں منجلی..

اس کے بعد مندرجہ ذیل دو شعر لکھ کر کاٹ دیے گئے ہیں جو متداول نسخوں میں بحال رکھے گئے ہیں:

نہیں ہم سر اس کا کوئی جز علی   کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی

ہوئی جو نبوت نبی پر تمام   ہوئی نعمت اس کی وصی پر تمام

اس کے بعد نیچے حاشیے پر یہ شعر ہے جو متداول نسخوں میں نہیں پایا جاتا:

گہر خر چہار اند و گوہر چہار   فروشندہ را با فضولی چہ کار

اس کے بعد بارہ شعر لکھ کر کاٹے گئے ہیں جو مروجہ نسخوں میں علیٰ حالہٖ ہیں۔

(ب)

نسخے کے حاشیے پر کئی مقامات پر اشعار اضافہ کیے گئے ہیں اور وہ متداول نسخوں کے متن میں شامل ہیں ۔ چند مثالیں ، جہاں نشان (✓) بناکر حاشیے پر اضافہ کیا ہے ، یہ ہیں :

کہا زیسر سے ہم نے بہر شگوں
کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

کنچوں کو سارنگیوں کو بنا
خوشی سے ہر اک اس کی طربیں ملا

کوئی فن میں سنگیت کے شعلہ رو
بسرم جوگ لچھمی کی لیے پر ملو

کوئی دائرہ میں بجا کر بسرن
کوئی ڈھمڈھمی میں دکھا اپنا فن

کوئی ڈیڑھ گت ہی میں پاؤں تلے
کھڑی عاشقوں کے دلوں کو ملے

وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھانو
لگی جاوے آنکھیں لیے جن کا نانو

لیے ہاتھ میں پھلجھڑی مالنیں
چمن کو پھریں دیکھنے بھالنیں

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
چمیری لگاویں کہیں کھود کر

کروں علم اس کا کہا تک بیاں
کہ ہے خوب اب مختصر پر یہاں

لمبا خط کھینچ کر حاشیے کی طرف اشارہ کرکے جو اشعار درج ہوئے ہیں ، ان میں سے ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے :-

محبت کی آئی جو دل میں ہوا وہاں سے اسے لے اڑی دل ربا

ہوا جب زمین سے وہ شعلہ بلند ہوا میں ستارا سا چمکا دو چند
جلے رشک سے اس کے شمع و چراغ کہ اس مہ کا پہنچا فلک پر دماغ
شب مہ میں وہ یوں زمیں سے اُٹھا چلے شیر جس طرح سے جوش کھا
غرض لے گئی آن کی آن میں اڑا کر وہ اس کو پرستان میں

(ج)

اکثر مقامات پر شاعر نے مصرعوں میں ترمیم کر کے بندشوں کو چست اور مصرعوں کو رواں بنایا ہے - اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

ہوئی شب لیا مہ نے جام شراب
گیا سجدہ میں شکر غ کر آفتاب

ہوئی شب لیا مہ نے جام شراب
گیا سجدۂ شکر میں آفتاب

یہ دیکھا جو عالم تو غش کر گئیں
وہ جیتی جو آئیں تھیں سب مر گئیں

یہ عالم جو دیکھا تو غش کر گئیں
وہ جیتی جو آئیں تھیں سب مر گئیں

دکھا شاہزادے نے پشت کمر
وہ چوٹی کا کولہے پہ آنا نظر

وہ گدی وہ شانہ و پشت کمر
وہ چوٹی کا کولہے پہ آنا نظر

وہ ہر اک طرف کیاریاں بے شمار
چنیں اک طرف ڈالیوں کی قطار

اور اک طرف وہ کیاریاں بے شمار
چنیں اک طرف ڈالیوں کی قطار

کہا خوان پز کوں خبردار کر
کہ رکھیو تو خاصہ کوں تیار کر

کہا خاصہ پز کوں خبردار کر
کہ رکھیو تو خاصہ کوں تیار کر

ولے پاوں جب اس کا تہ تک گیا
کنواں اس کے درشن سے روشن ہوا

ولے پاؤں جب اس کا تہ تک گیا
کنواں اس کے اندوہ سے بھر گیا

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ ہے دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

وہ دل لینا رکھ اپنے ہاتھوں پہ ہات
اٹھانا وہ دامن کا ٹھوکر کے سات

وہ دل پسنا ہاتھ پر دھر کے ہات
اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے سات

پلا ساقیا ساغر بے نظیر
کہ ہجران غم میں ہے بدر منیر

پلا ساقیا ساغر بے نظیر
پھنسی دام ہجراں میں بدر منیر

(د)

اکثر مقامات پر قوافی بھی بدل دیے گئے ہیں ۔ ان کی چند مثالیں یہ ہیں :

رہ حمد میں تیری عز و شرف
تجھے سجدہ کرتا چلوں سر ہدف

رہ حمد میں تیری عز و جل
تجھے سجدہ کرتا چلوں سر کے بل

چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل
کہ مشتاق ہیں جس کے دریا سنبل
چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل
کہ مشتاق ہیں جس کے یاں جزوکل

رہیں لخلخے اس میں روشن مدام
معطر شب و روز صبح و شام
رہیں لخلخے اس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس سے مشام

بھبھوت اپنے تن سے صفائی سے مل
رکھ انڈوہ کو مہ کے شب آئی نکل
بھبھوت اپنے سر تن سے ملا سر بسر
کیا دلؐجو اپنے کو خونی جگر

کہا تب پری زاد نے ہات اٹھا
انگوٹھا اوپر ہات یوں کر کہا
کہا تب پری زاد نے ہات لا
انگوٹھا دکھایا کہ اترا نہ جا

گیا ماہ رخ کوں یہ فرمان جب
ہوئی خوب سیں وہ پریشان عجب
گیا ماہ رخ کوں یہ فرمان جب
ہوئی خوب سیں وہ پریشان تب

کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا
ارے دیو تو کیوں دوانا ہوا

کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا
ارے دیو تو اتنا اترا نہ جا

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ پانی کی جیسے جھڑی

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ باد بہاری چلی

(ہ)

اس مسودے میں اشعار کے اندر معانی و مطالب کے اعتبار سے بھی بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں ، اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں :

سبھوں کو وہی دین و ایمان ہے — یہ دل ہے تمام اور فشاں جان ہے
... ... — یہ تن ہی تمام اور وہی جان ہے

دھرے تھے جو تکیے اک انداز کے — سر نہر بیٹھی تھی وہ ناز سے
دیے کہنی تکیے پر انداز سے — سر نہر بیٹھی تھی وہ ناز سے

(و)

ایسی کاٹ چھانٹ کثرت سے موجود ہے جو صرف مصنف ہی کیا کرتے ہیں ۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

کروں پہلے توحید یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے میں پہلے قلم

کروں پہلے توحید یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے میں اول قلم

کسی سیں بر آوے نہ کچھ کام جاں
جو وہ مہرباں ہو تو سب مہرباں

کسی سیں بر آوے نہ کچھ کام جاں
جو وہ مہرباں ہو۔ تو کل مہرباں

کیا حق نے نبیوں کا سردار اسے
بنایا نبوت کا سردار اسے

کیا حق نے نبیوں کا سردار اسے
بنایا نبوت کا حقدار اسے

نہ ہونے کا سایہ کے یہ ہے سبب
ہوا صرف کعبہ کے پوشش کوں۔ سب

نہ ہونے کا سایہ کے تھا یہ سبب
ہوا صرف پوشش میں کعبہ کے سب

وہ بارہ اماموں کا گلشن کا گل
بہار ولایت کا باغ سنبل

دیار امامت کے گلشن کا گل
بہار ولایت کا باغ سنبل

خدا سے لگا کرنے وہ التجا
کہ مسجد میں کرتا وہ یاد الہ

خدا سے لگا کرنے وہ التجا
لگا آپ مسجد میں رکھنے دیا

ہوا جب کہ نو خط وہ شیریں قلم
بڑھا کر لکھے اس نے ساتوں قلم

ہوا جب کہ نو خط وہ شیریں قلم
بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم

عجب نازنیں عالم اس پر ہوا
اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

عجب عالم اس نازنیں پر ہوا
اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں
لگے ٹوٹنے چاند ہر لہر میں

پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں
لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں

(ز)

مثنوی کا سب سے اہم پہلو اشعار کی اس طرح کی کاٹ چھانٹ ہے جس میں اشعار کی تحریر میں چلتے چلتے پورا مصرعہ، اس کا کوئی جز یا کوئی ایک آدھ لفظ کاٹ کر مصرعے کا رخ بدل دیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں اس نسخے میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں صرف چند مثالیں نمونہ مشتے از خروارے دی جاتی ہیں:

پلا ساقیا مجکو—

پلا مجکو ساقی محبت کا جام — کہ مہمانیوں کا ہوا دن تمام

خس و خار حسن—

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے — سدا حسن اور عشق میں لاگ ہے

پری زاد نے تب موہنہ—

پری زاد نے تب پکڑ اس کا ہات — شتابی بٹھا تخت پر اپنے سات

اسی طرح ہر شب دیا کیجیے

اسی طرح ہر شب کرم کیجیے — مری بزم رشک ارم کیجیے

مرے بیٹھنے سے یہ مشکل ہوئی

مرے بیٹھنے سے اذیت ہوئی کہ مہمانیوں سے مصیبت ہوئی

ہوا ایک دیوؤں کا یاں واں گذر ... ...

ہوا ناگہاں ایک کا واں گذر ... ...

مرا عذر ہووے یہ تقصیر ——

مرا عذر تقصیر ہووے قبول بحق نبی و بہ آل رسول

... ... بحق صحابی بہ آل رسول

لے آیا ہوں خدمت میں بھر نثار

لے آیا ہوں خدمت میں بھر نیاز یہ امید ہے پھر کہ ہوں سرفراز

ان قرائن و شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بے موقع نہ ہوگا کہ سحرالبیان کا یہ قلمی نسخہ خود مصنف کا مسودہ ہے -

(۲)

نسخے میں تین باتیں البتہ ایسی ہیں جو مدتوں میرے لیے سوچ بچار کا سبب رہی ہیں - یہ قلمی نسخہ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں میری نظر سے گذرا تھا - اس وقت سے لے کر ۱۹۶۵ء تک اظہار رائے میں پس و پیش کا سبب یہی باتیں تھیں - اول یہ کہ اس میں بعض الفاظ جو ملا کر لکھنے چاہئیں تھے جدا جدا کر کے لکھے گئے تھے ؛ مثلاً سوجائی بجائے سجھائی ، ٹوٹ نے بجائے ٹوٹنے وغیرہ ، دوسرے اس میں اضافت کے مقامات پر بھی ے کا استعمال اور بالعکس بھی دیکھنے میں آیا ؛ شرع نبی کی بجائے شرعی نبی ، رہ حمد کی جگہ رہی حمد - تیسرے بعض املا کی غلطیاں بھی ملیں مثلاً کہ کی جگہ کے ، ازدحام کی جگہ اژدھام ، گلزار کی جگہ گذار - اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید نسخہ مصنف کا نہ ہو - لیکن دوسرے قرینے اتنے قوی تھے کہ پھر فیصلہ نسخہ٭ مصنف ہونے کے حق میں جاتا تھا - ان چودہ برس میں اس دور کے کئی قلمی نسخے نظر سے گزرے اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ لفظوں کو توڑ کر لکھنے کا رواج پاک و ہند کے کاتبوں کے ہاں دسویں گیارھویں صدی سے چل کر بارھویں صدی تک برابر رہا

ہے ، اضافت اور 'یے' کے سلسلے میں بھی غفلت کی مثالیں بکثرت بارھویں صدی ہجری میں دیکھنے میں آئیں - ازدھام اور ازدحام کی غلطی مصنفین آج تک کرتے ہیں - گلزار کا لفظ حسن کے معاصرین کے لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں بھی "ذ" سے ہے - چنانچہ مجموعہ نغز کے علاوہ خود میر حسن نے گلزار میں ز کی جگہ ذ شمار کر کے مثنوی گلذار ارم کا سنہ' تصنیف نکالا ہے - اس لیے میری دانست میں سحر البیان کا یہ مسودہ مصنف کا خود نوشت ہے - اس کی بنیاد پر راقم الحروف مثنویات میر حسن کی جلد دوم ترتیب دے چکا ہے جو عنقریب مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوگی - اس نسخے کے بارے میں بعض دیگر معلومات اس ایڈیشن میں ملیں گی -

(۷)

سحر البیان کے اس نسخے کے ساتھ تین مثنویاں اور بھی ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے دکنیات سے تعلق رکھتی ہیں - اس میں مثنوی لعل و گہر از عاجز تو یقیناً اسی کاتب کی لکھی ہوئی ہے - باقی دو مثنویاں کا انداز تحریر صرف ایک حد تک ملتا جلتا ہے -

قصہ' لال و گوہر کا مصنف عاجز ہے - مثنوی کے خاتمے میں خود کہتا ہے :

ارے عاجز سخن کب تک کہے گا سخن کی فکر میں کب تک رہے گا

خموشی میں زبان کوں آشنا رکھ ہوا افسانہ آخر مدعا رکھ

الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ اونھوں کوں دوجہاں میں سرخرو رکھ[۱]

عارف الدین عاجز دکن کے مشہور شاعر ہیں ، ان کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی ، دربار آصفی میں عروج پایا اور فوج کے بخشی ہوئے - مثنوی لال و گوہر کے علاوہ ان کے دیوان کا نسخہ بھی کتب خانہ' آصفیہ میں پایا جاتا ہے - مثنوی کے متعدد قلمی نسخے یورپ اور دکن کے کتاب خانوں

۱ - نسخہ زیر بحث ورق ۸۳ ب -

میں ملتے ہیں۔[1] بقول ہاشمی عاجز کا انتقال ۱۱۷۸ھ میں ہوا[2] لیکن اگر گل عجائب پر بھروسا کیا جائے تو عاجز ۱۱۷۵ھ میں فوت ہوا[3] ۔ مثنوی لال و گوہر کا سنہ تالیف معلوم نہیں ۔ جناب نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۵۰ھ کے بعد کی تالیف ہے ۔[4] اس لحاظ سے اس کا زمانۂ تالیف ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۷۵ھ کے مابین قرار دیا جا سکتا ہے ۔ مثنوی کم از کم چار بار طبع ہو چکی ہے ۔ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۷ء میں مدراس اور بمبئی سے ، ایک اشاعت مصطفائی پریس مظفرگڑھ سے اور ایک مطبع حیدری بمبئی سے ۱۴ رجب ۱۲۸۲ھ کو بارہ قصوں کے مجموعے میں چھپی ۔ آخر الذکر اشاعت راقم الحروف کے کتاب خانے میں موجود ہے ۔ مثنوی کے قلمی نسخے کئی لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں ۔

قصۂ سوداگراں کے مصنف کا نام معلوم نہیں[5] اور نہ اس کے کسی اور قلمی نسخے کا علم ہے ۔ نسخۂ زیر بحث کے ورق ۸۷ الف پر درج شدہ اشعار صحیح طور پر نہیں پڑھے جا سکے ۔ ان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر غوث الاعظم کا مدح خواں اور انہی کے سلسلۂ ارادت سے تعلق رکھتا ہے ۔ شاہ میراں کا ذکر بھی ہے ۔ ایک شعر یوں معلوم ہوتا ہے :

توجہ رحمت اپنے پر کرو تم اے شہ میراں
صفائے باطنی ہوئے آسے از حضرت میراں

---

۱ ۔ دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) طبع پنجم (۱۹۶۰ء) صفحہ ۳۲۳ ۔
۲ ۔ دکن میں اردو (ہاشمی) طبع ششم (۱۹۶۲ء) صفحہ ۳۲۴ اور دکنی ادب کی تاریخ (ڈاکٹر محی الدین قادری زور) طبع ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۴۷ لکھا ہے کہ عاجز آخری زمانے میں ناندیڑ میں ایک عزیز کے ہاں مقیم تھے کہ سنہ ۱۷۶۴ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ۔
۳ ۔ گل عجائب صفحہ ۸۵ ۔
۴ ۔ کتاب خانۂ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (ہاشمی) ۱۹۵۷ء صفحہ ۶۳۶ ۔
۵ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ایک قصہ سوداگر از شاہ رحمن مکتوبہ ۱۲۶۳ھ موجود ہے معلوم نہیں کہ اس سے جدا ہے یا یہی ہے ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فہرست مخطوطات صفحہ ۳۳۴ بذیل نشان ۶۰۳ ۔

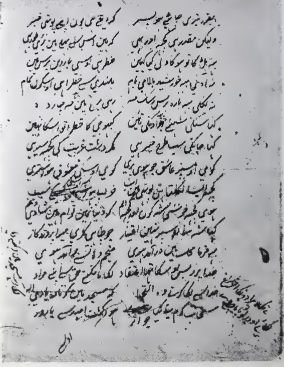

(۱)　سحرالبیان ، ورق ۸ الف ، اشعار میں حک و اصلاح کی گئی ہے

ادریس سال بن بیره ت بتقو   رماادیک حمل زوج بیرشاه کو [illegible]

[illegible]

خوش سیمل بدانستی جملوس سرب   کوی دم بین بحتاسی حوکت بیب
گردن نغمه تهنیت کو [illegible] شروع   گرد ایک سا کسه کری بیر طالع
کی نو مینی جبث سیر [illegible] غذر   سوا کرمایس سیکری توندبیسه
[illegible] حسن بر اوسکی [illegible]   اوسی دبگه سیاب سوا قتاب
خواهون بی خواجه [illegible]   کی تذریق [illegible] نیان ادر کها
صادکت تجمی ابی بسنه نیک بخت   که سدا سوا دارست تاج و تخت
سکندره خواد ادر دارا حشم   فلک جرست در عطارد رقم
[illegible]   غلامی کری لوسکی خاقان چین
به سنتی بی مژده [illegible] نماز   کی لاکه سجده ای بی نیاز
تجمی فغفور کتی نهاین گهتی بار   ندو تحسی پاوس امیدوار
دد کانه غرض شکر کا کردا   تجلا کر شانی جبس کا
عجب اس شکل سی ده مواد بدیر   دکها نام اوسکا شه بی نظیر
ده نظرین خواهو تجی خوجو کی یه   دیاین خلعت عزت کی انعام دی

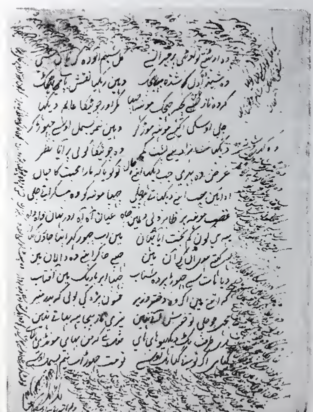

(۳) ورق ۲۸ ا جس کے حاشیے پر اضافے ہیں

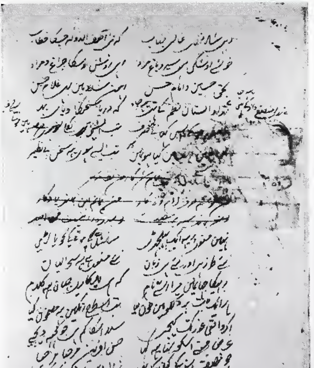

(۳) ورق ۶۳ ا، خاتمے کے اشعار

رحمت بظاہر تخلص ہے - اس سے اوپر ایک شعر ہے :

مرا یہ حال سب دیکھیا شفقت مجھ پہ کی رحمت
خدا نے آن کی برکت سے مری سب دور کی زحمت

اس مثنوی کی زبان دکنی ہے - رحمت نام کا ایک شاعر دکن میں ملتا ہے - دور آصفی کے شعرا میں خواجہ رحمت اللہ رحمت ایک صوفی بزرگ اور شاعر ہوئے ہیں - یہ عاجز کے معاصر ہیں اور ان کے نام پر اودگیر کے قلعہ‌دار عبدالقادر خاں نے رحمت آباد کا گاؤں بھی آباد کیا تھا - نائب رسول اللہ کے لقب سے بھی مشہور ہیں - انھوں نے کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے تنبیہ النسا نے زیادہ شہرت پائی[1] - ۱۱۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا[2] - لیکن اس دور کے کسی بزرگ شاہ میراں کا حال معلوم نہیں - شاہ میراں ان سے اقدم ہوئے ہیں - قطب شاہی دور میں میراں شاہ معروف تھے جن کو محی الدین ثانی قرار دیا گیا ہے - ان کے مرید سلطان تھے اور سلطان کے مرید افضل تھے - افضل شاعر ہوئے ہیں - انھوں نے محی الدین نامہ (مثنوی) لکھی - یہ مثنوی ۱۰۰۵ھ کے بعد کی تصنیف ہے - مثنوی کے علاوہ افضل کے مرثیے بھی ملتے ہیں - افضل نے اپنی اس مثنوی میں اپنے مرشد سلطان اور ان کے مرشد میراں شاہ کی تعریف کی ہے اور حضرت غوث الاعظم کے مناقب و فضائل بیان کیے ہیں[3] مصنف خواہ افضل ہو یا کوئی دوسرا اپنے مرشد کا نام سلطان محی الدین بتاتا ہے جو معروف شاہ یا شاہ معروف میراں کے خلیفہ تھے - شاہ معروف نے مصنف کی تربیت اپنے خلیفہ سلطان کے سپرد کی - شاہ معروف کا حال معلوم نہیں ڈاکٹر زور نے سید شاہ معروف مدفون کڈلور اور ان کے پوتے شاہ معروف کا ذکر کیا ہے لیکن یقین کے ساتھ ان میں سے کسی ایک کو شاہ سلطان کا مرشد

---

۱ - دکن میں اردو - طبع ششم صفحہ ۳۲۶ -

۲ - اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) کے اردو مخطوطات (نصیر الدین ہاشمی) جلد دوم ۱۹۶۱ء صفحہ ۸۹ -

۳ - کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (ہاشمی) صفحہ ۶۸۳ -

نہیں بتایا[1] - اس طرح شاہ میراں افضل کے بزرگ معاصر قرار پاتے ہیں - ممکن ہے ان کے مریدوں میں رحمت تخلص کا کوئی شاعر بھی ہو جس نے قصۂ سوداگراں لکھا ہے -

تیسری مثنوی قصہ پٹھان و باہمنی نجم الدین کی تصنیف ہے اور شاعر نے مثنوی کے آخر میں اپنا نام اور سنۂ تصنیف درج کیا ہے :

نجم دین قصہ کوں کر تو ختم — عجب کچھ بنایا گھر کر نظم
سنہ یک ہزار سو اوپر شصت سال — بنایا ہوں قصہ عجب نیک فال[2]

یہ مثنوی گویا ۱۱۶۰ھ میں تصنیف ہوئی -

میر حسن کا انتقال محرم ۱۲۰۱ھ میں ہوا - تینوں مثنویاں حسن کی وفات سے قبل تصنیف ہو چکی تھیں ، لال و گوہر ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۷۵ھ کے مابین ، قصہ سوداگراں ۱۱۹۵ھ سے قبل اور بگمان غالب ۱۰۵۰ھ کے کچھ بعد ، قصہ پٹھان و باہمنی ۱۱۶۰ھ میں -اگر اس تمام نسخہ زیر نظر کو میر حسن کا مکتوبہ بھی قرار دیا جائے جب بھی باقی تینوں مثنویوں کے سنین تالیف ہمارے استدلال کے خلاف نہیں جاتے -

---

۱ - نسخہ زیر بحث ورق ۹۲ الف - اس کے دو قلمی نسخے کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہیں (فہرست ص ۸۴ ، ۸۵) نیز ایک نسخہ انڈیا آفس میں (بلوم ہارٹ شمارہ ۵/۷۳) ادارۂ ادبیات کی فہرست مخطوطات کی رو سے دکنی میں بھی نسخہ ہے (فہرست جلد اول ص ۲۵۳) -

۲ - فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اول ص ۸۳ ، ۸۴ -

میر حسن اور سحر البیان

(۱)

'سحر البیان' کے مصنف میر حسن (غلام حسن) ساداتِ ہرات میں سے تھے[1] - ان کے مورثِ اعلیٰ میر امامی موسوی بعہدِ شاہجہان واردِ دہلی ہوئے[2] - خاندان کی بود و باش دہلی میں تھی[3] - والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا - ضاحک کے والد میر عزیز اللہ بھی حسن اور ضاحک کی طرح شاعر تھے ، ان کا تخلص مخلص بیان کیا جاتا ہے[4] - میر ضاحک صاحبِ دیوان تھے - ان کا دیوان اب دریافت ہو چکا ہے اور اس کے کچھ حصے شائع بھی ہو گئے ہیں[5] - ان کا ننھیالی تعلق حضرت بندہ نواز گیسو دراز'' کے خاندان سے تھا[6] - وہ عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے -

میر غلام حسن ، حسن ، میر ضاحک کی اولاد تھے - محلہ سید واڑہ (پرانی دلی) میں ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء کے قریب پیدا ہوئے[7] - ابتدائی حالات تفصیل سے معلوم نہیں - صرف اس قدر معلوم ہے کہ دلی میں سنِ تمیز کو پہنچے - بچپن سے موزوں طبع تھے 'بیچ لڑکائی کے' خواجہ میر درد کی صحبت

۱ - میر حسن ، دیباچہ دیوانِ حسن ، مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۱۳۳ - شیر علی افسوس ، دیباچہ سحر البیان عبدالباری آسی (مرتب) مثنویات میر حسن ، ص ۱٦ ، طبع نولکشور ۱۹۴۵ء -

۲ - میر حسن ، دیباچہ دیوانِ حسن ، نیز تذکرۂ شعرائے اردو ، ص ۲ ، ۵۳ ، ۱۰۴ ، طبع ثانی ۱۹۴۰ء -

۳ - دیباچہ سحر البیان ، ص ۱٦ -

۴ - قلمی بیاض مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری -

۵ - معاصر ، پٹنہ ، شمارہ ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ -

٦ - ابوالحسن (مترجم) تذکرۂ شعرائے اردو ، ص ۲۲ -

۷ - میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۱۹۰ تا ۲۰۴ -

سے دلی میں مستفید ہوئے[1] ۔ آغاز جوانی تھا کہ دلی کے سیاسی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر میر ضاحک نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ اودھ کا رخ کیا[2] ۔ بقرائن اصح میر حسن ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ کے لگ بھگ اپنے باپ کے ہمراہ دلی سے نکلے ۔ راستے میں ڈیگ میں چار ماہ قیام رہا ، مکن پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے ۔ یہاں ایک برسات گزار کر فیض آباد چلے آئے ۔ فیض آباد اس زمانے میں اودھ کا دارالسلطنت تھا ۔ 'تذکرۂ شعرائے اردو ، (میر حسن) کے ایک اندراج سے میر حسن کے فیض آباد پہنچنے کا زمانہ ۱۷۶۶ء - ۱۷۶۷ء/۱۱۸۰ھ - ۱۱۸۱ھ کے مابین محصور کیا جا سکتا ہے[3] ۔

میر حسن اگرچہ بچپن سے شعر کہتے تھے لیکن ان کی شعرگوئی کا باقاعدہ سلسلہ فیض آباد ہی میں شروع ہوا ۔ پہلے وہ میر ضیاء الدین ضیا (شاگردِ سودا) کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے ، جب سودا فیض آباد آئے (۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ) تو میر حسن اُن سے بھی اصلاح لیتے رہے[4] ۔ میر حسن شجاع الدولہ کے برادرِ نسبتی سالار جنگ (م ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ) کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوئے اور ان کے فرزند نوازش علی خان سالارِ جنگ کے مصاحب مقرر کیے گئے[5] ۔ ذی القعدہ ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا اور آصف الدولہ وارثِ سلطنت ہوئے ۔ انھوں نے فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا ۔ ۱۷۷۶ء/۷ ۔ صفر ۱۱۹۰ھ[6] کے بعد غالباً میر حسن بھی اسی زمانے میں لکھنؤ آ گئے ہوں گے ۔

سالارِ جنگ کی سرکار سے میر حسن کو بہت معمولی رقم ملتی تھی

---

۱ ۔ افسوس ، دیباچہ سحر البیان ، ص ۱۶ ، ۱۷ ۔
۲ ۔ ایضاً ۔ صفحات متعلقہ ، نیز میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۰۹ تا ۲۲۶ ۔
۳ ۔ افسوس ، دیباچہ سحر البیان ، نیز میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۶۰ ۔
۴ ۔ مصحفی ، تذکرۂ ہندی مرتبہ مولوی عبدالحق ، ص ۱۶ ، طبع ۱۹۳۳ء ۔
۵ ۔ میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۷۲ ، ۲۷۳ ۔
۶ ۔ تاریخ فرح بخش متعلقہ صفحات ۔

اور گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی ۔ شاید اسی لیے بعض دوسرے اصحابِ اقتدار کے قصیدے بھی ان کے ہاں ملتے ہیں[۱] ۔ ۱۷۸۱ء/۱۱۹۶ھ کے بعد جب سالار جنگ آصف الدولہ کے معتوب ہو گئے تو میر حسن کو مالی مشکلات نے اور بھی ستایا ہوگا ۔ چنانچہ میر حسن نے آصف الدولہ کے دامن سے وابستہ ہونے کی سعی بھی کی[۲] ۔ انھوں نے قصائد کے علاوہ ایک مثنوی آصف الدولہ کے باورچی خانے کی تعریف میں بھی لکھی ۔ 'سحرالبیان' بھی آصف الدولہ ہی کے نام سے معنون کی گئی ، اگرچہ خاطر خواہ صلہ نہ ملا[۳] ۔ میر حسن کا آخری سرمایۂ حیات 'سحر البیان' ہے جو ۱۷۸۳ء/۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوئی ۔ میر حسن ۱۷۸۵ء/ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ میں بیمار ہوئے اور ۱۷۸۶ء/عشرہ محرم ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا ۔ انھیں مفتی گنج میں دفن کیا گیا[۴] ۔

میر حسن کے دس گیارہ برس کے ساتھی اور سالار جنگ کے متوسل میر شیر علی افسوس کا بیان ہے کہ میر حسن کے چار بیٹے تھے[۵] ۔ بعض محققین کو اس سے اختلاف ہے ۔ ان کی رائے میں میر حسن کے تین بیٹے ہوئے[۶] ۔ میر حسن کی اولاد میں خلق اور خلیق بطور شاعر کچھ شہرت رکھتے ہیں ۔ خلیق کے بیٹوں میں سے میر انیس نے مرثیہ نگاری میں بڑا نام پایا ۔

(۲)

میر حسن کا کل سرمایۂ شعری ایک دیوان (جس میں چھ قصیدے ،

۱ ۔ میر حسن ، تذکرۂ شعرائے اردو ، صفحہ ۸۵ ، مرزا علی لطف گلشن ہند ، ص ۱۸۸ طبع ۱۹۳۳ء امر اللہ الہ آبادی ، تذکرہ مسرت افزا (ترجمہ ، حسن) ۔

۲ ۔ میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۳۰۳ ، ۳۰۴ ۔

۳ ۔ افسوس ، دیباچہ سحر البیان ، ص ۱۶ ۔

۴ ۔ میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۳۱۱ ، ۳۱۲ ۔

۵ ۔ افسوس ، میر شیر علی ، دیباچہ سحر البیان ، ص ۱۶ ۔

۶ ۔ رسالہ تہذیب الاخلاق ، لاہور ، جنوری ، مارچ ، ۸ تا ۱۴ ۔ ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء و ۸ مارچ ۱۹۶۷ء ۔

غزلیات کا دیوان اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں) ، بارہ مثنویوں اور ایک تذکرے (تذکرۂ شعرائے اردو) پر مشتمل ہے ۔ 'دیوانِ میر حسن' غالباً ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں مدون ہو چکا تھا ۔ 'تذکرۂ شعرائے اردو' کا آغاز ۱۷۷۰ء/۱۱۸۳ھ میں اور اولین تکمیل ۱۷۷۵ء / ۱۱۸۹ھ میں ہوئی اور پھر ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ سے باقاعدہ مرتب کیا گیا اور ایک آدھ اضافہ بعد میں بھی ہوا[2] ۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں : 'نقلِ کلاونت' ، 'نقلِ زنِ فاحشہ' ، 'نقلِ قصاب' ، 'نقلِ قصائی' ، 'مثنوی در شادیٔ آصف الدولہ' (۱۷۶۹ء/ ۱۱۸۳ھ) ، 'رموز العارفین' (۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ) ، 'مثنوی ہجو حویلی' (بقرائن ۷۶-۱۷۷۵ء/۱۱۸۹-۱۱۹۰ھ) ، 'گلزار ارم' (۱۷۸۸ء/۱۱۹۲ھ) ، مثنوی در 'تہنیت عید' (بقرائن ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ) 'مثنوی در وصف قصرِ جواہر' (بقرائن ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ) ، 'مثنوی خوانِ نعمت' (غالباً ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)[3] ۔ 'سحر البیان' کی تحریر کا زمانہ کئی برس پر محیط ہوگا[4] ۔ انھوں نے اس کی تحریر میں جان کاوی سے کام لیا ہے ۔ اس نظم پارے میں ان کی محنت اور صناعی اپنے عروج پر ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے دیگر مثنویوں میں جو فنی تجربے کیے ہیں ان کا بہترین سرمایہ یہاں استعمال کیا ہے ۔

(۳)

مثنوی نگاری کا فن میر حسن کے ہاں کم از کم تین مرحلوں سے گزرا ہے ۔ 'نقلِ کلاونت' ، 'نقلِ زنِ فاحشہ' ، 'نقلِ قصاب' اور 'نقلِ قصائی' میں اسلوب کا وہ نکھار ، لہجے کی ہمواری اور تجربے کا وہ تنوع اور وسعت نہیں ہے جو دوسرے دور میں میر حسن کو حاصل ہوا ۔ گویا حسن کاری کے لحاظ سے یہ مثنویاں اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں ۔ ان میں کہیں کہیں بول چال کی زبان پر قدرت اور ڈرامائی اشارات کا استعمال ضرور پایا جاتا ہے ۔

۱ - اسپرنگر .Oudb Cat متعلقہ اندراج
۲ - رسالہ نقوش، لاہور (مقالہ بر تذکرۂ شعرائے اردو) ، جنوری ۱۹۵۷ء ۔
۳ - وحید قریشی ، مقدمہ مثنویات میر حسن ، ص ۳۰ تا ۳۸ طبع لاہور ۔
۴ - وحید قریشی (مرتب) مثنوی سحر البیان ، ص ۱۹۳ ، لاہور اکیڈمی ، لاہور طبع ۱۹۶۶ء ۔

'نقلِ قصاب' اور 'نقلِ قصائی' میں قصاب ٹولے کی زبان اور افتادِ طبع کا نقشہ کھینچا گیا ہے، لیکن یہ کاوشیں فنی لحاظ سے ادھوری اور ناقص ہیں۔ دوسرا دور 'مثنوی در شادیٔ آصف الدولہ'، 'مثنوی ہجو حویلی'، 'گلزارِ ارم'، 'مثنوی در تہنیت عید' اور 'مثنوی در وصف قصرِ جواہر' پر مشتمل ہے۔ یہاں حسن کی فنی بصیرت زیادہ جاذب و دلکش ہے۔ ان مثنویوں میں موضوع اور طریقِ کار کا اشتراک ہے۔ صرف 'رموز العارفین'، باقی مثنویوں کے انداز و موضوع سے مختلف ہے۔ اس دور کی دیگر مثنویوں میں میر حسن نے وصفیہ پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کی ہے 'رموزالعارفین' میں بیانیہ انداز زیادہ نمایاں ہے۔ موضوع کی عظمت کے باوجود 'رموزالعارفین' ہم پر وہ اثر نہیں چھوڑتی جو میر حسن کی دوسری مثنویوں سے ہوتا ہے۔ اس میں بیان کیے گئے مسائل تصوف، میر حسن کے گھر کی فضا سے متعلق ہونے کے باوجود اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ روحانی تجربات کی فلسفیانہ تعمیم میر حسن کے جذباتِ زندگی سے گہرا علاقہ نہیں رکھتی، یہاں میر حسن کی ذات اور موضوع کے درمیان بہت بڑا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ میر حسن مادی زندگی سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، چنانچہ ماحول سے گہرے جذباتی رابطے کی وجہ سے میر حسن کی دوسری مثنویاں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

(۳)

ان کی شاعری کا تیسرا دور 'سحر البیان' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ دونوں ادوار کا سرمایۂ تجربات یہاں زیادہ سلیقے سے صرف ہوا ہے۔ خصوصاً دربار کے مناظر، شادی کی رسومات، محلوں کی زندگی کی تفصیل، فضا کو روشنی اور سائے کے حوالے سے بیان کرنے کا ڈھنگ میر حسن کے جذباتی ردِ عمل کا عکس ہے۔ میر حسن نے باقی مثنویوں میں زبان و بیان کے نئے تجربے محدود پیمانے پر کیے ہیں اور 'سحر البیان' میں انہیں زیادہ تنوع اور مہارت سے برتا ہے۔ مکالمے میں مختلف طبقوں کے لب و لہجے اور روزمرہ کا اہتمام بھی ہے۔ وہ طبعاً تصویر کاری کے شائق ہیں اور ان کا یہ رجحان بھی دوسرے دور میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ زندگی کے مختلف دائروں سے تعلق رکھنے والی اصطلاحات و معلومات کا ذخیرہ بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہے۔ یہ سارے ذرائع فیض آباد اور لکھنؤ کے گلی

کوچوں پر پہلے آزمائے گئے ہیں ، اس کے بعد 'سحر البیان' کی تخیلی کہانی میں ان سے کام لیا گیا ہے ۔ میر حسن کے ہاں علمِ مجلس کا ذوق ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے مختلف مظاہر ، طبقات کے خصوصی میلانات اور انسانی سرشت سے واقفیت کا میر حسن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ یوں تو ہماری منظوم و منثور داستانوں میں تدریسی رجحان اہمیت رکھتا ہے ، لیکن میر حسن آس پاس کی زندگی سے گہرے جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اس انداز کے زیادہ ہی مشتاق ہیں ۔ اگرچہ 'سحر البیان' ایک خیالیہ ہے ، جس سے میر حسن نے اپنی ذاتی خواہشات کے نکاس کا کام لیا ہے لیکن تخیل بھی اپنا مواد تو آخر زندگی ہی سے حاصل کرتا ہے ۔ 'سحر البیان' میں داستانی سرمائے کا کچھ حصہ بھی استعمال میں آیا ہے[1] ۔ کہانی کے اجزاء مختلف داستانوں سے ماخوذ ہیں ، لیکن مثنوی کے تار و پود ، گرد و پیش کے شعور اور زندگی کے پھیلاؤ کو جذباتی سطح پر محسوس و مصور کرنے کا جو انداز میر حسن نے اختیار کیا ہے اس نے مثنوی کو مؤثر و دلکش بنا دیا ہے ۔ اس سماجی پیش منظر اور عقبی فضا میں شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا عہد صاف جھلکتا ہے ۔ مثنوی کی چار تہیں بہت واضح ہیں :

(الف) ایک رخ وہ ہے ، جس میں میر حسن ہمارے سامنے ایک داستان گو کے روپ میں آتے ہیں ۔ کہانی کے مختلف اجزا قدیم داستانوں میں بکھری ہوئی صورت میں ملتے ہیں ۔ محیر العقول کارنامے ، جن ، پریاں ، دیو ، کل کا گھوڑا ، وقت کا تھم جانا ، فاصلوں کا مٹ جانا ، کہانی سننے والوں کو ایک دوسری ہی دنیا میں لے جاتی ہے ۔

(ب) دوسرا پہلو یہ ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اصل سے زیادہ خوبصورت اور اصل سے زیادہ اطمینان بخش ہے ۔ 'سحر البیان' کے مناظر بھی اسی دوسری دنیا کے منظر معلوم ہوتے ہیں ۔

(ج) تیسرا پہلو یہ ہے کہ تخیل کی سطح پر تخلیقی قوتوں کے اظہار میں ایک عینی انداز اختیار کیا ہے ۔ داستان گو کے ہاں کچھ

۱ ۔ وحید قریشی (مقالہ) مثنوی سحر البیان ، رسالہ اردو ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۵۱ء ۔

مثالی تصورات ، کچھ ماضی کے کارنامے ، کچھ ذاتی خواہشات کی ترجمانی ہوا کرتی ہے ۔ 'سحر البیان' بین السطور میں عصری معاشرت کی جھلک رکھتی ہے[1] ۔ ان عصری تفصیلات کے ساتھ ساتھ اعتقادات و نظریات کی وراثت بھی ہے ۔ میر حسن نے اپنے دور کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے ماحول میں بعض خامیوں کو محسوس کیا اور اس کی تلافی تخیل کی مدد سے کی ۔ میر حسن کے زمانے میں امن و امان کی جنس نایاب ہو رہی تھی ۔ دلی کے غیر مطمئن سماجی حالت نے انسانی زندگی کو غیر محفوظ اور غیر یقینی ہونے کا احساس دلایا ۔ میر حسن کا تخیل اور مثنوی کے قصے کہانیاں اس کمی کو پورا کرتے ہیں ۔ میر حسن نے اصل زندگی کی تصویر کشی میں زندگی کا معیاری اور مثالی نمونہ بھی سامنے رکھا ۔ میر حسن صرف اپنے دور کی جھلکیاں نہیں دکھاتے ، اپنے معاشرے کے ساتھ ساتھ مثالی تصورات کو بھی پیش کرتے ہیں ۔ وہ یہی نہیں بتاتے کہ ان کا ماحول کیسا ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسے معیاری شکل میں کیسا ہونا چاہیے ۔ 'سحر البیان' کا بادشاہ بادشاہت کا مثالی نمونہ ہے اور شہزادہ معیاری شہزادہ ہے ، وزیر زادی عقل و خرد کی معراج ہے ۔ ملک میں کہیں چوری کا ڈر نہیں ، کہیں کوئی خرابی نہیں ۔ روپے کی ریل پیل ہے ، سخاوت کی انتہا ہے ۔ وفاداری کا معیاری نمونہ نجم النساء ہے ، عشق کا معیاری نمونہ بے نظیر اور بدر منیر ہے ، طوائف کا مکمل روپ عیش بائی ہے ۔

(د) 'سحر البیان' کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ مثنوی کی معاشرتی زندگی بہت پھیلی ہوئی نہیں ہے ۔ عصری معاشرت کے تمام مظاہر میر حسن نے پیش نہیں کیے ۔ اپنے دور کی معاشرتی زندگی ہی سے انہوں نے صرف ایک طبقے کو منتخب کیا ہے اور باقی

---

۱ - سید احتشام حسین ، تنقیدی جائزے (مقالہ بر مثنوی سحر البیان) طبع اول ۔

طبقات اسی مرکزی طبقے کے حاشیہ برداروں کے طور پر پیش ہوئے ہیں ۔ یہی حاکم طبقہ کہانی کا مرکز و محور ہے'۔ 'سحر البیان' اپنے دور کی معاشرت کے صرف ایک پہلو کی عکاس قرار پاتی ہے ۔اس کی اپیل (اثر) اتنی وسیع نہیں رہتی جتنی پیر وارث شاہ کی ، جس میں تمدنی زندگی کا حلقہ میر حسن کی مثنوی سے کہیں زیادہ وسیع ہے ۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سایہ تیزی سے پھیلنے لگا ۔ ریاست اقتصادی شکنجے میں کس دی گئی ۔ اس دوسرے دور کے شعراء میں ناسخ کو اہمیت دی گئی ۔ اردو شاعری داخلیت اور خارجیت کے امتزاج کی بجائے سرعت سے خارجیت کی طرف چلی گئی میر حسن کے زمانے کے لوگ زندگی کی ظاہری چمک دمک کی طرف بڑھنے لگے تھے ۔ نفاست اور خوش سلیقگی کی قدروں نے فن کی جگہ لینی شروع کر دی تھی ۔ مجلسی آداب اور رسم و رواج کو آرٹ کا درجہ حاصل ہوتا چلا گیا ۔ زندگی کا براہِ راست تجربہ موقوف اور خارجی سہارے زیادہ اہم ہوئے ۔ اچھے لفظ ، خوش نما ترکیبیں ، عمدہ محاورہ ، خوبصورت شعر تحریکِ شعری کا سبب ہوگئے ۔

(۵)

میر حسن کے زمانے میں شعراء اپنی حقیقی زندگی سے ابھی اتنے اجنبی نہیں ہوئے تھے اور نہ اپنے آپ ہی سے ہراساں ہو کر زندگی کا کوئی مصنوعی بدل تلاش کرنے میں مصروف تھے ۔ ابھی تمدنی زندگی اتنی کھوکھلی بھی نہیں تھی ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دولت تھی ، لیکن اس کے استعمال کا عمدہ مصرف نہ تھا ، اس لیے عیش و عشرت ہی کو اصل زندگی سمجھ لینا ممکن تھا ۔ پُر شوکت درباری زندگی ، باغات ، شادیوں کے مناظر اور طوائفوں کی اہمیت معاشرتی زندگی میں بڑھ گئی ۔ عہد شاہی آداب معاشرت فیض آباد اور لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بکھر گئے ۔ اس دور کے عام

---

۱ ۔ رضیہ سلطانہ ، مثنوی سحر البیان (ایک تہذیبی مطالعہ) ، ص ۲۰۸ ، طبع دہلی ۱۹۶۳ء ۔

باشندوں کے لیے بھی یہی جاگیردار گروہ معیاری طبقہ ہو سکتا تھا - ساری معاشرتی زندگی اسی کے گرد گھومتی تھی - جاگیردارانہ نظام میں سلطنت کا وارث اور اس کے خاندان کا تمدنی درجہ رعایا کے لیے مثال بنتا ہے - ہماری داستانیں ، ہماری مثنویاں دربار اور اس کے گرد و پیش کی فضا سے مزین ہیں - سحر البیان میں بھی اسی اونچے طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے - دربار کی زندگی ، امیروں کی زندگی ، درباری آداب ، یہی اس تمدنی زندگی کے اصل رنگ ہیں اور اس ماحول کا ہر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم بھی اپنے آپ کو اس معیاری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے -

دراصل 'سحر البیان' میں ایسے معاشرے کی تصویر کشی ہے جسے فراغت حاصل ہے - قصے کے تمام کردار اسی آسودہ حالی اور فارغ البالی کے مظہر ہیں - ان کے مصائب یا تو ان کے اپنے پیدا کردہ (اور عام عاشقانہ نوعیت کے) ہیں یا پھر عالمِ بالا سے نازل ہوئے ہیں اور اسباب و علل کی کڑیوں کے پابند نہیں - عارضی غموں سے ہٹ کر زندگی لذت یابی کا وسیلہ ہے - مال و دولت عام ہے ، شراب ہے ، موسیقی ہے ، لذتیں ہیں ، درباری ٹھاٹھ ہیں ، جلسے ہیں ، جلوس ہیں ، شادی ہے ، شہنائیاں ہیں ، نقیب ہیں ، چوبدار ہیں ، کھانے با افراط ہیں ، سامانِ آرائش بکثرت ہیں ، باغات کی شوکت اور محلات کا تجمل بھی ہے ، خواص ، کنیزیں ، مغلانیاں خدمت کو حاضر ہیں - پرستان میں بھی اودھ کے دربار کا سا ساماں ہے بلکہ دربار اودھ کی ہو بہو نقل ہے[1] ، یعنی جنوں اور پریوں کی مملکت میں بھی درباری آداب ، رہنے سہنے کے طریقے اور معاشرتی لوازم ملتے ہیں اور وہ بھی عام انسانوں کی طرح سوچتے اور عمل کرتے ہیں - غالباً اسی پہلو کے پیش نظر مصحفی نے مثنوی کو "نگار خانۂ چین" قرار دیا تھا اور زندگی کے قریب ہونے کی وجہ سے انہی عناصر نے سحرالبیان کو ایک روایت کا درجہ دے دیا ہے - 'سحرالبیان' کے عمومی لہجے اور انسانی زندگی سے قرب ہی کی وجہ سے کچھ ماورائی قوتیں اس سے منسوب ہوگئیں - دور دراز کے ملکوں تک اس کے قلمی نسخے لے جائے گئے - قارئین کے مختلف طبقوں نے اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق

---

۱ - گوپی نارنگ ڈاکٹر (مقالہ سحر البیان) تنقیدی ادب جلد دوم ، مرتبہ میرزا ادیب ، طبع لاہور ۱۹۶۵ء

اس سے لطف لیا ۔ مقلدین نے تقلیدیں کیں ، بعض نے جواب لکھے ، کسی نے نثر کا روپ دیا اور کسی نے ڈرامے کی صورت میں ڈھالا اور 'سحر البیان' کی سادہ سی کہانی ہر شخص کے لیے نئی معنویت اختیار کر گئی ۔

(٦)

بدر منیر کی آرائش و زیبائش لکھنؤ اور دلی کے ملے جلے فیشن پر مشتمل ہے ۔ اودھ کے فرمانروا بھی معیار پرست تھے ۔ انھوں نے فیض آباد اور لکھنؤ میں جو فضا قائم کی وہ دلی کے تیموری فرمانرواؤں کے نمونے پر تھی ۔ میر حسن بھی مجبور ہیں کہ سواری کا جلوس ، نوبت ، نقارے ، ماہی مراتب ، سائبان اور دوسرے لوازم اسی ماحول سے اخذ کریں ۔ عیش باغ کا ناک نقشہ لکھنوی طوائف کے عین مطابق ہے ، اس کا راگ رنگ ، رقص و سرود نور بائی گائن کی یاد دلاتا ہے ۔ یہی طوائف اردو شاعری کی روائتی محبوبہ بھی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ فراغت کی زندگی سے عیاشی پیدا ہوئی ۔ 'سحر البیان' کے بے عمل کردار بھی عیاش لوگ ہیں ۔ وہ واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد نہیں کرتے ، بلکہ حالات کے دھارے میں بے دست و پا ہیں ۔ بے نظیر دنیا بھر کے علم حاصل کرتا ہے ، بہادر ہے ، عقل مند ہے ، لیکن اس کی زندگی میں جب بھی عمل اور پیش قدمی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہماری توقعات کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے ۔ اس کا باپ بھی قسمت پر شاکر ہے ۔ شہزادے کے گم ہونے پر ایسے واویلا کرنے کے سوا کچھ کام نہیں ، شہزادی بدر منیر عشق و محبت میں صرف رونا دھونا جانتی ہے ۔ غشی کے مسلسل دورے اس کی بے بسی اور بے چارگی کو ظاہر کرتے ہیں ۔

اس طرح کے بے عمل کرداروں کے سہارے پلاٹ کی تعمیر ممکن نہ تھی ، اس لیے میر حسن کو جابجا غیبی سہاروں کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اتفاقات بار بار کہانی میں شریک ہوتے ہیں ۔ کبھی بے نظیر کی عمر بارہ سال سے ایک دن کم ہونے کی وجہ سے کہانی پیچیدہ ہوکر آگے بڑھتی ہے ، ناگہانی طور پر پری کا ورود ہوتا ہے ، پھر کل کا گھوڑا تیسری پیچیدگی پیدا کرتا ہے ۔ اتفاقاً دیو بے نظیر اور بدر منیر کو دیکھ لیتا ہے ، کہانی پھر آگے بڑھنا شروع کر دیتی ہے ۔ نجم النساء اتفاقاً فیروز شاہ سے ملتی ہے ،

اچانک فیروز شاہ کو اس سے عشق ہو جاتا ہے - فیروز شاہ بے نظیر کو پری کی قید سے رہائی دلاتا ہے اور یوں غیبی طاقتیں کہانی کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں - جابجا اتفاقات رونما ہوتے ہیں ، یہاں تک کہ داستان اپنے انجام تک جا پہنچتی ہے - یہ عناصر اس دور کی معاشرتی حالت کا بالواسطہ اظہار ہیں - یہ زمانہ سیاسی اور سماجی پسپائی کا ہے - خارجی زندگی کی ناکامیوں نے بے عملی کو جنم دے رکھا ہے - ایسی حالت میں کہانی کے کردار بھی عمل اور حرکت سے عاری نظر آتے ہیں -

(ے)

کہانی کا ہیرو بے نظیر اردو غزل کا مثالی عاشق ہے - وہ اس نقشے کو پیش نہیں کرتا جس کے مطابق ایک عاشق کو دوسرے عاشق سے اس کے داخلی کوائف اور خارجی افکار کی مدد سے الگ کیا جا سکے - وہ تو ایسی مثالی تصویر ہے جہاں عاشق میں ساری دنیا کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں یعنی وہ معیار ہے جس پر عاشق کو پورا اترنا چاہیے - وہ حسن میں بے مثال ہے ، ذہانت میں بڑھ چڑھ کر ہے ، پریاں بھی اسے دیکھ کر عاشق ہو جاتی ہیں ، بدر منیر بھی پہلی نظر میں گھائل ہو جاتی ہے - اسے وصل کی نعمت میسر ہوتی ہے ، لیکن زیادہ‌تر ہجر کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں - وہ وفاداری بشرطِ استواری کا قائل ہے - غم میں گریباں چاک کرتا ہے - بدر منیر بھی محبوبہ کا مثالی روپ ہے - حسن میں بے مثال ، جلی کٹی سنانے میں تاک ، ہار سنگھار کی شائق اور عاشق کو جلانے کے انداز جانتی ہے - ہجر کا صدمہ اسے بھی بے حال کرتا ہے ، لیکن جذبات کی تندی و تیزی اسے کسی خارجی عمل پر مجبور نہیں کرتی - لکھنوی طوائف کی طرح وہ بھی کھل کھیلنا جانتی ہے - طوائف کا یہی روپ ہمیں نجم النساء میں بھی ملتا ہے ، اگرچہ "نجم النساء سحر البیان کا واحد جاندار کردار ہے جس کی حرکت اور عمل قصے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے"-[۱]

'سحر البیان' کا بادشاہ چاہے وہ بے نظیر کا باپ ہو ، چاہے مسعود شاہ ہو ، اپنے لہجے اور روپ سے بادشاہ معلوم ہوتا ہے - شہزادہ بے نظیر کے

۱ - فہمیدہ شیدا ، میر حسن کی کردار نگاری (تحقیقی مقالہ ایم - اے اردو) ص ۱۰۵ تا ۱۵۹ -

وہنے سہنے کا طریقہ اور انداز گفتگو شہزادوں کا سا ہے۔ بدر منیر شہزادیوں کی سی گفتگو کرتی ہے اور اپنی ہمجولیوں سے خصوصاً نجم النساء سے چھلیں کرتے ہوئے لکھنؤ کے اونچے گھرانے کی خواتیں کا روزمرہ بولتی ہے۔ رمال اور نجومی اپنی خاص اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے بھی بادشاہ کے دبدبے کے سامنے مرعوب ہیں، پنڈتوں کی بول چال اور جوگن بنتے وقت نجم النساء کا لہجہ ہندوانہ ہو جاتا ہے۔ نچلے طبقے کی عورتیں درباری رسم و رواج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں عیش بائی ایک ایسی طوائف ہے جس کے ہر انداز میں بے حیائی اور کھل کھیلنے کا انداز موجود ہے۔ پریاں اور جنات بھی مافوق الفطرت طاقت رکھنے کے باوجود اپنے کرداروں میں بہت کچھ انسانی اوصاف رکھتے ہیں۔ نجم النساء وزیر زادی ہے۔ ہماری داستانوں کے معیار کے مطابق عقل و تدبر کے جملہ محاسن وزیر اور وزیروں کی اولاد کو حاصل ہیں۔ اس کی گفتگو کا انداز شہزادوں کے مرتبے سے ایک درجہ نیچے رہتا ہے۔ اس طرح کہانی کے بنیادی کردار اپنی نوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔

(۸)

فنی لحظ سے 'سحر البیان' کا جائزہ لیا جائے تو اس میں میر حسن کی ذہانت پلاٹ کی تشکیل میں بروئے کار آئی ہے۔ پلاٹ کے اجزا نئے نہیں ہیں، لیکن میر حسن کہانی سنانے کے فن سے واقف ہیں اور سننے والے کے لیے دلچسپی کا مسلسل سامان مہیا کرنے کے گر سے بھی آشنا ہیں۔ 'سحر البیان' پڑھتے ہوئے ہماری توجہ کہیں بھی کہانی کے بھاؤ سے نہیں ہٹتی۔ واقعات کی کڑیاں باہم مربوط ہیں اور ہماری یہ توقع ہر جگہ قائم رہتی ہے کہ اگلے قدم پر کوئی نہ کوئی اہم بات ہونے والی ہے۔ کہانی سلسلہوار پیچیدگی اختیار کرتی جاتی ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے میر حسن واقعات کا ایک ایک تار سلجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی کے ان اجزاء میں افسانے کی سی تکنیکی باریکیاں تلاش کرنا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ داستان گو نہ افسانہ نگار ہے نہ ناول نویس۔ اس کے ہاں واقعات کی معمولی بے تدبیریوں کا ہونا یقینی ہے اور 'سحر البیان' بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ داستانوں میں پلاٹ کا محیرالعقول ہونا اور سننے والوں کی دلچسپی کو بحال رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، اس میں تخیل کی رنگ

آمیزی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ پلاٹ اور اس تفصیلات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس لیے قصے میں معمولی کوتاہیاں روا رکھی جاتی ہیں اور اس کی تلافی کرداروں کو زندگی کے مطابق بنا کر اور مناظر کو دلکش اور دلنشین دکھا کر کی جاتی ہے ۔ میر حسن طبعاً محاکات پسند ہیں ۔ موقعے اور محل کے مطابق تصویریں کھینچ کر وہ پڑھنے والے کو کیف و مستی میں ڈبو دیتے ہیں ۔ ان کے ہاں پس منظر نکھرا ہوا ہے اور اس میں نور کی چکا چوند ہے ۔ ایک کامیاب فن کار کی طرح وہ وحدتِ تأثر کے گر سے واقف ہیں اور شہوانی خواہشات کی پر اسرار قوتوں سے کہانی کے اجزاء کو ربط و تسلسل عطا کرتے ہیں ۔ 'سحر البیان' کے دیو اور پریاں اپنے ، ہنسنے بولنے اور سماجی قیود کے اعتبار سے ہماری آپ کی طرح کے انسان ہیں ۔ ان کی زندگیاں بھی اسی طرح خوشی اور رنج و غم سے عبارت ہیں جس طرح عام انسان کی ۔ ان کی سرشت کا یہ انسانی پہلو جنوں اور پریوں کو ہمارے قریب تر کر دیتا ہے ۔

مگر اس بات کو تسلیم کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ 'سحر البیان' اردو کی چند عظیم مثنویوں میں سے ہے ۔ اس میں اگرچہ محدود زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے لیکن اپنی محدودیت کے باوجود میر حسن نے جس زندگی کو پیش کیا ہے وہ ہمارے لیے دلچسپی کا وافر سامان مہیا کرتی ہے ۔ اس میں جذبات و احساسات کا تنوع ، کرداروں کا نازک فرق اور زبان و بیان کے لطیف پیرائے ہیں ۔ ہندی ، عجمی طریقِ بود و باش کو میر حسن نے ایک ماہرِ فن کی طرح منعکس کیا ہے ۔ مثنوی کی شہرت اور مقبولیت کا راز میر حسن کی اعلیٰ فنی صلاحیت ہے ۔

”خوانِ نعمت“ — ایک محاکمہ

(۱)

”ماہِ نو“ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں جناب عبادت بریلوی نے میر حسن کی مثنوی ”خوانِ نعمت“ کو شائع فرمایا ہے اور ابتداء میں ایک تمہید ہے جو غالباً قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ فاضل محقق نے معاصر مواد کو پیش نظر نہیں رکھا، اس لیے بعض مقامات پر وہ ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں۔ مثنوی کا متن ترتیب دیتے وقت بھی قلمی نسخوں کی عبارتوں پر مناسب توجہ نہیں فرمائی گئی جس سے میر حسن کی مثنوی کا متن اصل سے انحراف کر گیا ہے، ذیل میں چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کے اجداد کے بارے میں فرماتے ہیں :

”میر امامی کے بیٹے عزیز اللہ تھے اور ان کے بیٹے میر ضاحک تھے جو اپنی فارسی شاعری کے لیے مشہور ہیں۔“

اس جملے کی تردید خود اسی قلمی نسخے سے ہوتی ہے جو فاضل محقق کے پیش نظر ہے۔ اس کے شروع میں میر حسن کا اپنا دیباچہ درج ہے، جس میں اپنے خاندان کے بارے میں میر حسن نے لکھا ہے :

”اصل این مؤلف ابن میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ ابن میر برات اللہ ابن میر امامی یوسوی از شاہجہان آباد است۔“

تذکرۂ شعرائے اردو کے مطبوعہ نسخے میں مرتب کی غلطی یا شاید ناقص نسخے کے سبب برات اللہ کا نام رہ گیا ہے۔ دیباچہ دیوان میں شجرہ مکمل طور پر درج ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا جملہ بھی محل نظر ہے۔ میر ضاحک کو فارسی شاعری میں نہ اس زمانے میں کوئی مقام حاصل تھا نہ اب ہے اور ان

کی شہرت کی تنہا بنیاد ان کے غیر سنجیدہ اردو کلام کی وجہ سے ہے جس کا قلمی نسخہ پٹنہ میں دریافت ہو چکا ہے اور اس کے اقتباسات بھی رسالہ معاصر پٹنہ میں شائع ہوئے تھے ۔ میر حسن نے بھی اپنے باپ کی فارسی شاعری کا ذکر نہیں کیا ۔ میر شیر علی افسوس (جو میر حسن کے دوست اور ساتھی تھے) دیباچہ سحر البیان میں لکھتے ہیں :

"میر حسن کا دادا سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا ، لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی ، مگر طالب علمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا ۔ فارسی استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا ۔ قصیدہ بھی ایک آدھا اس مغفور کا رتبہ وار دیکھا ہے لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا ۔ غزل گہنی ترک کی تھی ۔"[۱]

ظاہر ہے اس سے میر ضاحک کی فارسی شاعری کی مقبولیت کا قیاس کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ۔

۲ ۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "وہ فیض آباد میں عرصہ دراز تک رہے ۔" میر حسن فیض آباد میں ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ پہنچے اور ۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے تو سالار جنگ لکھنؤ اٹھ آئے اور ان کے متوسل میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے ۔ وہ عنفوان شباب تک دہلی میں رہے تھے اور ۱۱۸۹ھ سے ۱۲۰۱ھ تک لکھنؤ میں قیام پذیر تھے ۔ اس لیے دلی اور لکھنؤ کے قیام کے مقابلے میں فیض آباد میں قیام کی مدت نو برس کے قریب پہنچتی ہے اور اسے عرصہ دراز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں تا آنکہ قیام لکھنؤ کو "دراز تر" نہ قرار دیا جائے ۔

۳ ۔ نیز ۔ فرماتے ہیں :

"میر حسن کی تعلیم و تربیت ان کے والد میر ضاحک کے زیر سایہ ہوئی انھوں نے بہت جلد فارسی زبان و ادب میں مہارت حاصل کر لی ۔"

۱ ۔ (مثنویات حسن مرتبہ عبدالباری آسی ، دیباچہ ۱۶)

بیر ضاحک کی اپنی فارسی دانی محل نظر ہے ۔ بیٹے نے باپ کی تربیت سے فارسی زبان و ادب میں مہارت حاصل کرلی ۔ یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ میر حسن فارسی زبان اور ادب دونوں میں مہارت رکھتے تھے ۔ میرحسن کا دیباچہ دیوان اور تذکرۂ شعراء ہمارے سامنے ہیں ۔ اس سے فارسی زبان میں مہارت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ فارسی ادب سے ان کی واقفیت معمولی اور سرسری تھی ۔ مہارت والی بات بہرحال مشکوک ہے اور میر حسن نے "بہت جلد" مہارت حاصل کرلی ہو ایسے کسی معاصر بیان یا شہادت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ میر حسن ۱۱۵۳ھ کے قریب پیدا ہوئے ۔ ان کا دیباچہ دیوان (بہ قیاس غالب) ۱۱۹۲ھ اور تذکرہ ۱۱۸۸ تا ۱۱۹۲ھ میں لکھا گیا ۔ اس لحاظ سے ان کی فارسی تحریر کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ۳۶-۳۷ برس کی عمر کے بعد کے ہیں اور اگر ۱۱۴۰ھ کو تاریخ پیدائش قرار دیا جائے (جیسا کہ آسی مرحوم کا قیاس ہے) تو یہ نمونے ۴۸ برس کی عمر کے بعد کے ہیں ۔ ان کی بنیاد پر یہ قیاس کرنا کہ میر حسن نے بہت جلد فارسی میں مہارت حاصل کرلی ہوگی کسی طرح صحیح نہیں ۔

۵ - ۶ - لکھتے ہیں :

"ثقاہت کو انھوں نے (میر حسن نے) کبھی ہاتھ سے نہیں دیا
اور درد و گداز کو وہ کبھی خیرباد نہ کہہ سکے ۔"

یہ دونوں باتیں بھی صحیح نہیں ۔ میر حسن کے اسی کلیات میں جو ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے پیش نظر ہے ۔ وہ ہجو موجود ہے جو سکندر کے خلاف لکھی گئی ۔ یہ انتہائی فحش اور رکیک ہے اور اسے کسی طرح بھی ثقاہت کے ذیل میں شمار نہیں کیا جا سکتا ۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کی مثنویات دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں ۔ انھوں نے اس قلمی نسخے میں میر حسن کا وہ کلام بھی دیکھا ہوگا ، جس میں قصاب اپنی بیوی سے گفتگو کرتا ہے ، حسن کی یہ مثنوی "ہجو قصائی" کے عنوان سے برٹش میوزیم کے اسی نسخے میں درج ہے جس پر ڈاکٹر صاحب نے مثنوی خوان نعمت کے متن کی بنیاد رکھی ہے ۔ "ثقاہت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا" کا جملہ اس اعتبار سے صحیح نہیں رہتا ۔ ان کا دوسرا دعویٰ بھی حقائق کے خلاف ہے ۔ حسن کے کلام کا کم از کم دو تہائی حصہ وہ ہے جس میں درد و گداز سرے

سے موجود ہی نہیں ۔ صرف ایک تہائی کلام درد و گداز رکھتا ہے ۔ اس لیے "درد و گداز کو کبھی خیرباد نہ کہہ سکے" بھی ساقط الاعتبار ہے ۔

(۲)

ے - ۸ - فرماتے ہیں :

"(دیوان حسن) کے دو اہم قلمی نسخے موجود ہیں ایک نسخہ تو علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن میں ۔ میوزیم کا نسخہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر اسپرنگر نے اپنی فہرست مخطوطات اودھ میں کیا ہے اور جو شاہان اودھ کے کتب خانوں میں رہ چکا ہے"۔

میر حسن کے دیوان کے ۳۴ نسخے معلوم ہیں اور ان میں سے کم از کم بیس نسخے آج تک موجود بھی ہیں ۔ نسخوں کی اہمیت کا تعین متون کی درستی اور قدامت تحریر پر منحصر ہے ، ذیل میں ان نسخوں کی فہرست دی جاتی ہے ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بہ اعتبار قدامت موتی محل کا نسخہ (جو ۱۱۹۲ھ کا مکتوبہ ہے) سب سے قدیم ہے ۔ اس کے بعد کتب خانہ رامپور کا نسخہ (۱۲۵۳ھ) اور پھر علی گڑھ کے نسخے (۱۲۳۲ھ) ازاں بعد خدا بخش پٹنہ لائبریری (۱۲۵۳ھ) کا نمبر آتا ہے ۔ برٹش میوزیم کا نسخہ ۱۲۵۹ھ کا مکتوبہ ہے ۔ علاوہ ازیں متن کی صحت کے اعتبار سے بھی مشکوک ہے ۔ اس لیے اسے اہم نسخوں میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا ۔ لٹن لائبریری کے نسخے کا متن بھی ہر جگہ قابل اعتماد نہیں ۔ اس کا قیاس ان اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو محمود فاروقی نے اپنی کتاب "میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء" میں اسی نسخے سے نقل کیے ہیں ۔

۱ - کلیات حسن	خدا بخش لائبریری پٹنہ مکتوبہ ۱۲۵۳ھ
۲ - کلیات حسن	مملوکہ سید محمد عباس چوہدری محلہ لکھنؤ
۳ - کلیات حسن :	کتب خانہ عالیہ رامپور ، مکتوبہ محمد رحیم اللہ خطاط - ۱۲۵۳ھ (گذرانیدۂ فرزند حسن نبیرۂ میرانیس ۱۹۰۶ء)
۴ - کلیات حسن :	کتب خانہ عالیہ رامپور

۵ - کلیات :	(شمس بریلوی)
۶ - کلیات :	(نصیر حسین خیال)
۷ - کلیات حسن :	(حسرت شروانی) مکتوبہ ۱۲۵۶ھ
۸ - کلیات حسن :	مملوکہ مرزا علی حسن (حسن کا خاندانی نسخہ)
۹ - کلیات حسن :	نسخہ عبدالسلام - علی گڑھ قبل از ۱۲۷۰ھ
۱۰ - دیوان حسن :	نسخہ سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ (ناقص الاخر)
۱۱ - دیوان حسن :	" " "
۱۲ - کلیات میر حسن دہلوی :	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ
۱۳ - کلیات میر حسن :	برٹش میوزیم ۱۲۵۹ھ
۱۴ - کلیات میر حسن :	(مولوی عبدالحق) ۱۹۳۷ء میں ضائع ہوا
۱۵ - کلیات میر حسن :	" "
۱۶ - کلیات حسن :	مملوکہ عبدالعلیم شیرکوٹی
۱۷ - دیوان حسن :	مملوکہ ذکی الحق پٹنہ
۱۸ - دیوان حسن :	مملوکہ قاضی عبدالودود
۱۹ - دیوان حسن :	(سری رام مرتب خمخانۂ جاوید)
۲۰ - کلیات :	بحوالہ سپرنگر
۲۱ - کلیات :	موتی محل لکھنؤ بحوالہ سپرنگر (۱۱۹۲ھ کا مکتوبہ)
۲۲ - دیوان حسن :	کتب خانہ سالار جنگ
۲۳ - لخت حسن :	(انتخاب ۱۳۲۷ھ)
۲۴ - دیوان حسن :	سالار جنگ ، مکتوبہ ۱۲۲۳ھ

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ برٹش میوزیم کا نسخہ وہی ہے جو شاہان اودھ کے کتاب خانے میں رہا - برٹش میوزیم کے نسخے کا مائی کرو فلم میرے سامنے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ مذکورہ جارج ہملٹن کے پاس تھا اور ۱۲۵۹ھ میں نقل ہوا - اس نسخے کا شاہان اودھ کے کتاب خانے سے کوئی تعلق نہیں -

(۳)

۹ - ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

> "میر حسن کی بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں - ان میں ۱ - خانۂ میر حسن ، ۲ - قصر جواہر ، ۳ - خوان نعمت خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں - خانۂ میر حسن راقم نے "افکار" ، جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع کر دی ہے - قصر جواہر ادب لطیف میں شائع ہو رہی ہے - خوان نعمت کا متن اب ماہ نو میں پیش کیا جاتا ہے -"

قصر جواہر بانکی پور پٹنہ کے نسخوں کی مدد سے قاضی عبدالودود صاحب نے معیار پٹنہ میں دو قسطوں میں شائع کی تھی اور جون و جولائی ۱۹۳۶ء کے پرچوں میں تمام و کمال چھپی تھی - اس لئے ڈاکٹر صاحب کا بیان صحیح نہیں کہ "میں سب سے پہلے اسے شائع کر رہا ہوں" - مثنوی خانۂ میر حسن اگرچہ مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی اس کے بعض اجزاء محمود فاروق کی کتاب "میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء" طبع اول (راولپنڈی اور طبع ثانی لاہور) میں پائے جاتے ہیں - علاوہ ازیں راقم کے تحقیقی مقالے "میر حسن اور ان زمانہ" میں بھی درج ہیں -

۱۰ - ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

> "افسوس ہے کہ مجھے اس کے (خوان نعمت کے) متن کی تیاری میں علی گڑھ کے نسخے کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا - میں نے صرف میوزیم کے نسخے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے - اس لیے بعض عبارتیں اس میں صحیح طور پڑھی نہ جا سکیں اور میں ان کی تصحیح بھی نہ کر سکا - پھر بھی اس اشاعت افادیت سے خالی نہیں -"

ڈاکٹر صاحب کو اقرار ہے کہ مثنوی کا متن صحیح طور پر مرتب نہیں ہوا۔ اور انھوں نے متن میں ان مقامات پر سوالیہ نشان بھی ڈال دیے ہیں جو ان سے حل نہیں ہو سکے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار میں اور بھی بہت سی اغلاط ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب نے کوئی نشان نہیں کیا ۔ اگر تمام غلطیوں کی نشاندہی کی جائے تو مقالہ خاصا طویل ہو جائے گا ۔ میں مجلس ترقی ادب کے لیے "مثنویات میر حسن" ترتیب دے چکا ہوں ۔ زیادہ تفصیل ان کے حواشی میں ملے گی ۔ فی الحال اس بحث کو چند مثالوں تک محدود رکھوں گا ۔

(۲)

مثنوی کے متن کے بارے میں عرض یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہر جگہ متن "ایک" اور حاشیے میں سوالیہ نشان دے کر "اک" کا اندراج کیا ہے ۔ اس بارے میں یہ صراحت شاید بے موقع نہ ہوگی کہ تیرھویں صدی تک قلمی نسخوں میں یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ ایک ، یہاں ، تیرا ، تیری ، میرا ، میری اشعار میں ان مقامات پر بھی بشمول یا ی لکھتے تھے جہاں یہ الفاظ بدون یا ی باندھے گئے تھے ۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھتے وقت بدون یا (ی) پڑھتے تھے ۔ یہی کیفیت "و" کی ہے کہ بشمول واؤ لکھ کر بعض اوقات بہ تخفیف واؤ پڑھتے تھے ۔ اس لیے متن کی تصحیح میں یا تو جدید املا کو اختیار کرنا چاہیے تھا یا پھر ان الفاظ کو بشمول یا ، واؤ لکھ کر ابتداء میں نوٹ دینا کافی تھا ۔ ہر جگہ حاشیے پر جدید املا اور سوالیہ نشان کی ضرورت نہ تھی ۔

قدیم نسخوں میں یائے معروف اور یائے مجہول کے املا میں پابندی نہ تھی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں زمانۂ حال کے املا کی پابندی کی ہے اور یائے معروف و مجہول کا امتیاز قائم کیا ہے ؛ لیکن بعض الفاظ کے معانی نہ جاننے کے سبب وہ غلطیاں کر گئے ہیں ؛ مثلاً دریائی کباب کو دریائے کباب بنا گئے ہیں ۔ اس طرح کی لاتعداد غلطیوں سے قطع نظر متن میں کئی مقامات پر سوالیہ نشان نہیں دیے ۔ ظاہر ہے وہ غلطیاں خود ان سے سرزد ہوئی ہیں ۔ برٹش میوزیم کے نسخے ہیں یہ مذکورہ مقامات صحیح طور پر درج تھے لیکن ڈاکٹر صاحب انھیں پڑھ نہیں سکے اور غلطی کھا گیے ہیں ۔ ان اشعار کی صحیح شکل ذیل میں درج کی جاتی ہے :

اشعار کی صحیح صورت	ڈاکٹر صاحب کی اغلاط
کباب اقسام کے رکھے وہ ہر سو	
بھریں دم فاختہ جن کا کہہ[۱] کوُ کوُ	۱ کہ
وہ تنگے[۲] اور نمش[۳] براق جوں برف	۲ تنکے ۳ غش
نہ پاوے جس کی لذت ہر تنک[۴] ظرف	۴ سک طرف
وہ شہ گاسے[۵] بھرے آشوں سے لبریز	۵ شہ گانے
جہاں ہو توسن رغبت کو مہمیز	
وہ بھرتے اور ترکاری کی دلمیں	
کہ جب کھولو تو باس ان کی ہو کل[۶] میں	۶ گلی میں
عجائب زیر بریاں نور محلی[۷]	۷ نور محلے
محل لطف سے مشہور محلی[۸]	۸ محلے
وہ سوندھے کرُ کرُے ساتھ اس کے پاپڑ	
کبھے دل ہاتھ کو آن پر کہ جا[۹] پڑ	۹ تڑ تڑ
وہ بشقابیں[۱۰] بھری بریانیوں کی	۱۰ منقابیں
ملبب قفلیاں بورانیوں[۱۱] کی	۱۱ پورالیوں
دھرے پکوان ہر سو اور تلادے[۱۲]	۱۲ تلاوے
تلادے[۱۲] گوشت کے بھی اور سادے[۱۳]	۱۳ ساوے
پتیرے سے لگا تا[۱۴] نان سنگی	۱۴ وہ (ڈاکٹر صاحب نے قیاس سے بدلا ہے اقرار ضروری تھا)
سمیت از نان نعمت ، ہفت رنگی	
وہ ٹکڑے دودھ کے پکے ہوئے سرد	
گدا[۱۵] لذت پہ جس کی ہر زن و مرد	۱۵ فدا (ڈاکٹر صاحب نے قیاس سے بدلا ہے اقرار ضروری تھا)
عجب جو[۱۶] تم گئے یہ چھوڑ کر ساتھ	۱۶ گو (" " " ")
جو یاں ہوتے تو پھیلاتے نہ تم ہاتھ	

خطائی اور کماچ اور گاؤدیدے
رَوے کے خشخشے ستھرے[۱۷] ملیدے — ۱۷ شیرے

ملائی کے پمیالے اور مسکے[۱۸] — ۱۸ ...کے
زبانوں میں ہیں اب تک جس کے چسکے — (ڈاکٹر صاحب پورا لفظ پڑھ نہیں سکے)

دمکتے نقل تھے وہ کورے کورے
رجھاوے جن کو مصری لے کے ڈورے[۱۹] — ۱۹ دوڑے

اگر اس وقت نعمت خاں بھی آتے[۲۰]* — ۲۰ ہوتے
تو اک راِستت بنا گانے[۲۱] کی گاتے — ۲۱ کھانے کی کھاتے

حسن کے جو سخن سے حظ اٹھاوے
خدا روز[۲۲] اس کو یہ نعمت کھلاوے — ۲۲ اور

یقین ہی جانیو اے میرے غم خوار
تمہارے بن تو دیکھا میں یہ گلذار[۲۳]** — ۲۳ گلزار

عبادت صاحب نے بعض الفاظ پر سوالیہ نشان بھی دیے ہیں ، مثلاً زیر بریانی ، استت اور مسکے پر علامت استفہام ہے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی - یہ الفاظ قلمی نسخے میں بالکل صحیح طور پر مذکور ہیں اور ان پر کسی شک یا شبہ کی گنجائش نہ تھی اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے دو شعر بدیں سبب خارج کر دیے ہیں کہ ان میں الفاظ کا املا مشکوک تھا حالانکہ ان اشعار پر ذرا سی توجہ ان کو حل کر سکتی تھی - ذیل میں یہ دونوں شعر دیے جاتے ہیں :

---

*یہ شعر امیر اللغات میں استت کے ذیل میں اسی طرح درج ہے - میں قیاس کرتا ہوں کہ دوسرا مصرعہ یوں ہوگا :

تو اک استت بنا گانے کی گاتے

** قلمی نسخے میں ذال ہے اور میر حسن ہمیشہ ذال سے لکھتے تھے - گلذار کی تاریخ بھی انھوں نے ذ ہی کی مدد سے نکالی ہے -

چپاتی گرم اور ستھرے وہ پھلکے***
روٹی کے جیسے گالے ہلکے ہلکے

پیالے کھیر کے جوں ماہ تاباں
مہکتے ، جیسے نسریں کا گلستاں

یہ چند مثالیں صرف مشتے از خروارے دی گئی ہیں ۔

***میر حسن نے یہاں پُھلکے کا تلفظ پَھلکے کیا ہے

مقدمہ مثنویات میر حسن

(۱)

میر حسن ابن میر غلام حسین ضاحک دہلی کے رہنے والے تھے ۔ ان کے مورث اعلیٰ میر امامی موسوی ہروی شاہجہان کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور دلی میں اقامت اختیار کی۔ خاندان کے تفصیلی کوائف معلوم نہیں ۔ میر ضاحک ۱۱۳۰ھ کے لگ بھگ دلی میں پیدا ہوئے[۱] ہزل گوئی میں اپنے زمانے میں نام پیدا کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صاحبزادے میر غلام حسن پرانی دلی کے محلے سیدواڑے میں ۱۱۵۳ھ کے گرد و پیش عالم وجود میں آئے[۲] ابتدائی حالات کا علم نہیں ۔ میر شیر علی افسوس (کہ ان کا حسن کا مدتوں ساتھ رہا) میر حسن کے ابتدائی حالات کے بارے میں صرف اس قدر بتاتے ہیں کہ حسن دلی ہی میں 'سن تمیز' کو پہنچا ، بچپن سے موزوں طبع تھا اور شعر کی 'رغبت' رکھتا تھا "اور اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید ہوا"[۳]۔ حسن نے اپنے دیوان کے دیباچے میں ابتدائی کلام میں سے ایک فارسی شعر بھی دیا ہے جس سے ان کی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے[۴]۔ ابتدائی تربیت میں عربی سے معمولی واقفیت اور فارسی کے گہرے

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۱۰۷ ببعد ۔

۲ - ایضاً صفحہ ۱۹۰ تا ۲۰۲ ۔

۳ - "طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی ، شعر کی رغبت رکھتا تھا ۔ اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید شاہجہان آباد میں اکثر لڑکائی کے بیچ ہوا ہے" ("مثنویات حسن" ، دیباچہ مرتبہ آسی صفحہ ۱۶ ، ۱۷) نیز "کلیات حسن" مخزونہ برٹش میوزیم ، مکتوبہ ۱۲۵۹ھ۔

۴ - "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۲۰۵ ۔

لگاؤ کا پتا چلتا ہے لیکن میر حسن کا اصل کمال شاعری کے علاوہ علم مجلس میں مہارت کی صورت میں رونما ہوا ۔ مثنوی "گلذار ارم" سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں میر حسن زلف گرہ گیر کا اسیر بھی ہوا تھا ۔ اس کی نوبت اس وقت آئی جب حسن اپنے باپ کے ہمراہ دہلی سے اودھ کی طرف روانہ ہوا[1] "تذکرہ شعرائے اردو" کے بعض اندراجات اور دلی کے عام سیاسی حالات نیز "گلذار ارم" کی مدد سے میر حسن کے دلی چھوڑنے کا زمانہ بہ قرائن اصح یہ ہے کہ حسن محرم ۱۱۷۹ھ میں دلی سے نکلے ، چار ماہ ڈیگہ میں قیام کیا ، ۱۷ جمادی الاول کو مکن پور میں تھے ، اسی ماہ کے آخر میں لکھنؤ گئے ، یہاں برسات گزاری اور جمادی الاول ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے بعد فیض آباد میں جا کر رہائش پذیر ہوئے ۔ میر حسن اس زمانے میں فیض آباد پہنچے جب نواب شجاع الدولہ وہاں تربولیہ ، لال باغ وغیرہ تعمیر کر چکے تھے ۔ "تذکرہ شعرائے اردو" کے ایک اندراج سے فیض آباد جانے کا زمانہ محدود کر کے ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین قرار دیا جا سکتا ہے[2]۔

حسن فیض آباد میں حبیب اللہ برادر زادۂ شاہ سجن اور میر ابراہیم سے روابط قریبہ رکھتے تھے ۔ میر حبیب اللہ ہی کے کہنے سے انھوں نے فارسی کی بجائے اردو شاعری کی طرف توجہ کی ۔ اصلاح سخن میر ضیا (شاگرد سودا) سے حاصل کی ۔ میر ضیا غالباً ۱۱۸۴ھ میں فیض آباد سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد سودا ۱۱۸۶ھ میں فیض آباد آئے ۔ سودا اور میر ضاحک کے درمیان ایک ادبی معرکہ انہیں دنوں پیش آیا ، یہ غالباً ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا واقعہ ہے[3] ۔ یہ گمان غالب اس سے کچھ قبل میر حسن سودا

---

۱ - بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور (دہلی) سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبۂ اودھ میں آیا ۔ سکونت فیض آباد میں اختیار کی ، علاقہ روزگار نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہنچایا ۔ دیباچۂ "سحر البیان" مرتبہ آسی صفحہ ۱۷ ۔

۲ - "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۲۲۳ تا صفحہ ۲۶۰ ۔

۳ - "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۲۷۰ بعد ۔

سے اصلاح لیتے رہے[1] اور جھگڑے کے فرو ہونے کے بعد پھر حسن کے تعلقات سودا سے استوار ہو گئے - میر حسن ، شجاع الدولہ کے برادر نسبتی نواب سالار جنگ کے زمرۂ ملازمین میں تھے - ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ اور ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کے مابین حسن نے یہ ملازمت اختیار کی[2] ان کے سپرد سالار جنگ کے بیٹے نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ کی مصاحبت تھی - اس نوکری ہی کے زمانے میں شجاع الدولہ نے ۲۳/۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں انتقال کیا اور آصف الدولہ اودھ کے نواب ہوئے - اسی زمانے میں آصف الدولہ نے مختار الدولہ سید مرتضیٰ خاں کو خلعت نیابت عطا کیا[3] مختار الدولہ نے آصف الدولہ کی ماں اور دادی سے ناراض ہو کر آصف الدولہ کو مشورہ دیا کہ سہندی گھاٹ چلیں[4] چنانچہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ کو آصف الدولہ اور اس کا لشکر سہندی گھاٹ چلے گئے - آصف الدولہ بیگمات اودھ (ماں اور دادی) سے دباؤ ڈال کر روپے وصول کرتا رہا اس طرح سہندی گھاٹ پر چار پانچ مہینے بیت گئے ، جب گرمیوں کا خاتمہ ہوا اور برسات آئی تو آصف نے فیض آباد کی بجائے متھرا کا رخ کیا - آخر شعبان ۱۱۸۹ھ میں آصف نے دریا عبور کر کے اٹاوے کا سفر کیا - ۲ صفر ۱۱۹۰ھ کو مختار الدولہ قتل ہوا اور اس کے بعد آصف الدولہ لکھنؤ چلا آیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا - آصف الدولہ کا ماموں سالار جنگ بھی اس وقت آصف کے ہمراہ تھا اور یہ بھی لکھنؤ چلا آیا - میر حسن سالار جنگ کے متوسلین میں سے تھا اس لیے وہ بھی لکھنؤ آ گیا - مثنوی "تہنیت عید" سے اس کے لکھنؤ جا کر بس جانے کا ثبوت ملتا ہے - اس طرح گویا

۱ - حسن کے سودا سے اصلاح لینے کی شہادت افسوس نے خود میر حسن کی زبانی بیان کی ہے -

۲ - "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۱۷۲ --- ۲۷۳ -

۳ - "تاریخ اودھ" (نجم الغنی) جلد سوم صفحہ ۱۵ میں ۲۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں لیکن "تاریخ فرح بخش" (انگریزی ترجمہ از ہوئے صفحہ ۱۳) میں ہے کہ سات آٹھ دن بعد آصف الدولہ نے دربار کر کے مرتضیٰ خاں کو نائب بنایا -

۴ - "تاریخ اودھ" (نجم الغنی) صفحہ ۲۹ -

میر حسن ۱۱۸۹ھ کے اواخر یا ۱۱۹۰ھ کے شروع میں لکھنؤ چلے آئے۔ حسن کو سالار جنگ کے ہاں گزر اوقات کے لیے معمولی رقم ملتی ہوگی۔ اس کی عسرت کا کنایتاً ذکر خود اسی کے "تذکرۂ شعرائے اردو" میں موجود ہے[1] اور اس کی تائید مرزا علی لطف کے بیان سے بھی ہوتی ہے[2]۔ سالارجنگ کی سرکار سے تعلق غالباً ۱۱۹۶ھ تک بحال و برقرار رہا اس کے بعد کے حالات کا پتا نہیں چلتا۔ یہ زمانہ خود سالار جنگ کے لیے خاصا پریشان کن ہوتا ہے کیونکہ آصف الدولہ کے ہاتھوں اس کی جاگیر کی ضبطی ہو جاتی ہے[3] تاہم میر شیر علی افسوس کا بیان اسے سالار جنگ سے وابستہ ظاہر کرتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ تعلق رسمی سا رہ گیا ہوگا۔ آخری زمانے میں میر حسن کی پریشان حالی کا مفصل ذکر "تذکرۂ مسرت افزا" کے مرتب نے کیا ہے[4]۔ اس زمانے میں حسن نے دوسرے امرا اور خود آصف الدولہ کے لیے مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ اس کی آخری تصنیف "سحر البیان" بھی آصف الدولہ کے نام سے منسوب ہوئی۔ حسن کو اس مثنوی پر بہت انعام و اکرام کی توقع تھی لیکن جو ملا اس کی قیمت افسوس کی زبان سے سنیے :

> "صلے کا اس کے ("سحر البیان" کے) ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دستہ بقچہ میں سے نکلوا کر مصنف کو عنایت کیا۔ رتبہ اس کا البتہ بڑھا پہ دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا لیکن کھوٹ صاف طالع کی ہے کیوں کہ مال کھرا، خریدار اتنا بڑا اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا بلکہ گھاٹا آیا[5]"

---

۱ - "تذکرہ شعرائے اردو" صفحہ ۵۳ -
۲ - "گلشن ہند" صفحہ ۱۱۸ -
۳ - "تاریخ فرح بخش" (انگریزی ترجمہ ہوئے) جلد دوم صفحہ ۱۲۰ -
۴ - "تذکرۂ مسرت افزا" صفحہ ۲۴، ۲۵ -
۵ - دیباچۂ افسوس۔ آسی صفحہ ۱۶ -

"سحر البیان" اس کا عمر بھر کا سرمایہ تھا جو ۱۱۹۹ھ میں تکمیل کو پہنچا ۔ حسن آخر ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ کو بیمار پڑے اور غرۂ محرم ۱۲۰۱ھ کو انتقال کیا اور لکھنؤ ہی میں مفتی گنج میں مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے ۔

میر حسن نے اپنے انتقال پر چار بیٹے چھوڑے ۔ ان میں سے تین ، میر مستحسن خلیق ، میر محسن محسن ، میر احسن خلق کے نام بہ طور شاعر عام طور پر معلوم ہیں چوتھے بیٹے سید احسان حسن مخلوق کا ذکر مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں کیا ہے[۱] اغلب یہ ہے کہ یہ حسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ۔ خلیق کے بیٹے میر انیس نے مرثیہ گوئی میں جو شہرت حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔

(۲)

حسن کی اولاد حقیقی کے ساتھ ساتھ اولاد معنوی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ خصوصاً "مثنوی سحرالبیان" نے اس کی شہرت کو عروج تک پہنچا دیا ۔ آج دنیا انھیں محض اسی مثنوی کے خالق کی حیثیت سے جانتی ہے حالانکہ وہ صرف "سحرالبیان" کے خالق نہیں بلکہ ایک درجن مثنویوں کے مصنف ، غزل اور دیگر اصناف پر مشتمل ایک دیوان کے مالک بھی ہیں ۔ انھوں نے ابتدا میں فارسی شاعری کی ، لیکن فیض آباد آنے کے بعد ان کی توجہ اردو کی طرف ہوگئی ۔ "دیوان حسن" اسلوب کے اعتبار سے دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے ، ضیاء کی طرز پر کہی گئی غزلیں اور سودا ، میر ، سوز ، درد ، حسرت کے انداز کی چیزیں ۔ گمان غالب یہ ہے کہ پہلی طرز کی چیزیں ۱۱۸۶ھ سے قبل کہی گئی ہوں گی اور دوسری طرز کی نوبت بعد میں آئی ہوگی ۔ "تذکرۂ شعرائے اردو" کا آغاز ۱۱۸۸ھ میں ہوا اور اولین روایت کی تکمیل ۱۱۸۹ھ میں[۲] ۔ اس میں حسن نے اپنی تصانیف میں مثنوی "رموز العارفین" ترکیب بند (واسوخت) اور سات آٹھ ہزار ابیات (دیوان) کا ذکر کیا ہے ۔ ۱۱۸۹ھ تک حسن کی تخلیقات کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا ۔ اسپرنگر کے ہاں "دیوان حسن" کے

---

۱ - "ریاض الفصحا" صفحہ ۳۰۷ ۔

۲ - تذکرے میں اضافے ۱۱۹۲ھ کے بعد تک ہوتے رہے ہیں ۔

دو نسخوں کا ذکر ہے ان میں ایک نسخے کے بارے میں یہ اندراج ملتا ہے :

"An other copy in the same collection without preface, written in a bad hand, with many erasures and corrections, is apparently an autograph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand

۲۵ ذوالحجہ پنج شنبہ ۱۹۲ھ در بنگلہ"[1]

گویا میر حسن کا دیوان غزلیات (مع متفرق کلام) ۱۱۹۲-۱۱۹۳ھ تک دیوان کی صورت میں مدون ہو چکا تھا - حسن کے کلیات و دواوین کے کم و بیش ۲۶ قلمی نسخوں کا علم ہوچکا ہے[2] جن میں ۱۱۸۹ھ کے بعد کا کلام بھی پایا جاتا ہے اور اشعار کی تعداد نو ہزار کے لگ بھگ ہوگی - ۱۹۱۲ء میں دیوان کا کچھ حصہ دیوان میر حسن کے نام سے نول کشور پریس سے شائع ہوا - پھر انتخاب سخن کے سلسلے میں حسرت موہانی نے حسن کی غزلیات کا انتخاب شائع کیا (دسمبر ۱۹۱۲ء) - ۱۹۴۳ء میں "غزلیات میر حسن" (غیر مطبوعہ) کے عنوان سے مرزا علی حسن نے سرفراز پریس لکھنؤ سے ۸۵ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع کیا - مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے حسن کی غزلیات کا ایک مجموعہ پریس میں دیا تھا اور اس کے کچھ فرمے چھپ بھی گئے تھے کہ ان کے انتقال کی وجہ سے کام ادھورا رہ گیا - پٹنہ سے جناب ذکی الحق نے میر حسن کی غزلیات کا متن تیار کیا تھا یہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا -

(۳)

"تذکرۂ شعرائے اردو" اور دیوان کے علاوہ میر حسن کی بارہ مثنویات کا علم ہو چکا ہے - میر حسن کی تمام مثنویات پر مشتمل کوئی مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - مجلس ترقی ادب کی طرف سے اب "مثنویات حسن" کو

---

۱ - "اودھ کٹالاگ" متعلقہ صفحات -

۲ - "ماہ نو" دسمبر ۱۹۶۵ء مقالہ راقم الحروف (بہ عنوان "خوان نعمت" — ایک عکس) -

دو جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے - پہلی جلد میں گیارہ مثنویاں ہیں - دوسری جلد "سحر البیان" اور پہلی اور دوسری جلد کے مکمل حواشی اور استدراکات پر مبنی ہوگی - فرہنگ اور اشاریے بھی دوسری جلد کے آخر میں درج کیے جائیں گے - "سحر البیان" حسن کی تخلیقات میں سب سے آخری تصنیف معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس کی تحریر کا زمانہ خاصی مدت پر منحصر ہوگا - حسن خود کہتے ہیں :

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر
تب ایسے ہوئے ہیں سخن دل پذیر[1]

باڈلین لائبریری کی فہرست مخطوطات کے مرتب کا بیان اگر قبول کیا جائے تو "سحر البیان" ۱۱۹۳ھ میں مکمل ہو چکی تھی[2] یہ رائے کس بیان پر قائم کی گئی تھی اس کا حال نہ کھلا - شاید سعادت خاں ناصر کے "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" (۱۲۶۱ھ) پر بھروسا کیا گیا - ناصر لکھتے ہیں :

"یہ بھی کیا خوب لطیفہ ہے کہ جب مرزا رفیع سودا نے وہ مثنوی سنی نہایت خوش ہوئے - فرمایا تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ غلام حسین (ضاحک) کے بیٹے نہیں معلوم ہوتے یعنی فخر ان کے ہو[3] -"

سودا کا انتقال رجب ۱۱۹۵ھ میں ہوا - اس پر اعتبار کیا جائے تو مثنوی ۱۱۹۵ھ تک مکمل ہو چکی تھی - لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ناصر غیر محتاط تذکرہ نگار ہے - اس لیے کسی دوسرے بیان کی غیر موجودگی میں اس پر اعتماد مشکل ہے - تاہم اس میں کلام نہیں کہ "سحر البیان" کئی برس کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اس کی تکمیل ۱۱۹۹ھ میں ہوئی اور

۱ - "مثنویات حسن" (مرتبہ آسی) صفحہ ۱۳۲ -
۲ - باڈلین کیٹالاگ کالم ۱۲۹۵ نمبر ۲۳۲۶ (۱۹) -
۳ - رسالہ "سب رس" نومبر ، دسمبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۰ -

اس وقت آصف الدولہ کے حضور میں پیش کی گئی۔ یہ مثنوی حسن کی تخلیقات میں سب سے زیادہ مقبول اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے کمال فن کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کے بے شمار قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں اور کلیات کے اکثر نسخوں میں بھی اس کا متن شامل ہے لیکن اس سے صرف نظر کرکے دیکھا جائے تو راقم الحروف کو اس کے ۵۳ قلمی نسخوں کا علم ہے۔

(۱) کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی[1]

(۲)، (۳)، (۴)، (۵)، (۶) پانچ قلمی نسخے کتب خانۂ رضائیہ رامپور[2]

(۷) سبحان اللہ کلیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ (بیاض فائق) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں "میرے پاس سحر البیان کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ ہے"[3] میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ سبحان اللہ کلیکشن کے نسخے کا حوالہ دے رہے ہیں یا ان کا ذاتی نسخہ ہے جو اسی سنہ کا مکتوبہ ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو علی گڑھ کے اس نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں :

مثنوی میر حسن دہلوی : یونیورسٹی اردو ادب : ۶۲ ابتدائی اوراق غائب، تعداد معلوم نہیں۔ سطر ۱۵۔

ابتدا :

جہاں فیض سے ان کے ہے کامیاب   نبی آفتاب و علی مہتاب

ترقیمہ :

نسخہ کتاب مثنوی تصنیف میر حسن بہ تاریخ ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۹۶ھ مکتوبہ شیو راج سنگھ برائے حاضر داشت لالا مان سنگھ۔

۱۔ بحوالہ مکتوب سید مسعود حسن رضوی ۱۱ اگست ۱۹۵۴ء۔

۲۔ عرشی، "دستورالفصاحت" ترجمۂ میر حسن۔

۳۔ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" صفحہ ۳۵۶۔

(۸) "مثنوی قصۂ بے نظیر و شہزادی بدر منیر" من تصنیف میر حسن علی (کذا) بہ دستخط بندہ تارا چند تحریر بہ تاریخ ۲۸ بساکھ ۱۹۱۶ء" (ترقیمہ) - یہ مثنوی داستان "سسی پنوں" (فارسی) مصنفہ اندر سین (محمد شاہ) کے ساتھ ایک ہی جلد میں اور اسی قلم سے لکھی ہوئی ہے - مملوکہ محمد حسن صاحب صدیقی صاحب ہیڈ ماسٹر ڈی - سی - ہائی سکول گکھڑ - نسخے میں املا کے اغلاط بہت زیادہ ہیں -

(۹) ورق ۶۶ آخری قطعہ ہائے تاریخ درج نہیں ہیں بلکہ تین ورق خالی - کاغذ اور رسم الخط سے تیرھویں صدی کے آخر کا نسخہ معلوم ہوتا ہے - مملوکہ عبدالمجید گوہر ، گوجرانوالہ -

(۱۰) پنجاب یونیورسٹی لائبریری ui VI 5B حسن کی وفات کے ۳۵ سال بعد لکھا گیا -

(۱۱) پنجاب یونیورسٹی لائبریری ui VI 5 C - ۱۲۷۳ھ -

(۱۲) مکتوبہ ۱۷ رجب ۱۲۳۶ھ علاقہ مالوہ میں لکھی گئی (انڈیا آفس کٹالاگ بلوم ، پارٹ صفحہ ۳) -

(۱۳) مصور نسخہ سو عدد تصاویر ، کاتب دیپ چند کھتری مکتوبہ ۲۰ اپریل ۱۸۲۱ء (انڈیا آفس کٹالاگ بلوم ، پارٹ ۲۷) -

(۱۴) نمبر ۱۳۲ کاتب سید رضا حسن ، مکتوبہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۲ھ (ایضاً صفحہ ۴۷) -

(۱۵) نمبر ۲۲۵ ایک مجموعہ مثنویات جس میں ابتدا سے ورق ۸۰ ب تک "سحر البیان" ہے مکتوبہ دہم ذوالحجہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جلوس (ایضاً صفحہ ۱۲۳ ، ۱۲۴) -

(۱۶) نمبر ۷۰ (ترقیمے میں حسن کو مرحوم لکھا ہے (برٹش میوزیم کٹالاگ صفحہ ۴۳) -

(۱۷) ۱۷ اس پر ڈاکٹر Pouhget کی ۱۲۱۲ھ کی مہر ہے (ایضاً) -

(۱۸) بہ خط نستعلیق (باڈلین لائبریری کٹالاگ کالم ۲۹۵ نمبر ۲۳۲۶) (۱۹) -

(۱۹) سنہ کتابت ۱۲۰۹ھ (کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی بہ حوالہ مکتوب مولوی عبدالحق صاحب ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء) -

(۲۰) ۱۱۹۹ھ (ایضاً) -

(۲۱) سنہ کتابت درج نہیں - (ایضاً) -

(۲۲) سنہ کتابت درج نہیں - (ایضاً) -

(۲۳) مصور نسخہ "بہ دستخط محمد منور شاہ - کتابت ہفتم جادی الثانی ۱۲۳۹ھ در خطۂ کشمیر (یہ نسخہ نیشنل میوزیم کراچی کی ملک ہے) -

(۲۴) مصور نسخہ عجائب گھر لاہور -

(۲۵) "سحر البیان" مع دیباچۂ افسوس - مملوکہ مولوی محمد شفیع صاحب (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۱۶ء) - اس مصور نسخے کی تصاویر عجائب گھر کے نسخے سے ملتی جلتی ہیں - مغلیہ مصوری کے انحطاطی دور کی یادگار ہے - رنگوں کی ترتیب میں بے پروائی سے کام لیا ہے شبیہیں سکھوں سے مشابہ ہیں - کل چھ رنگین تصویریں اور چند خاکے ہیں - ایک دو جگہ خاکے بھی نہیں ہیں صرف خالی جگہیں چھوڑ دی گئی ہیں - تعداد صفحات ۲۳۸ - ترقیمہ نا تمام ہے - نسخہ لاہور میں لکھا گیا متن بہت حد تک صحیح اور قدیم معلوم ہوتا ہے -

(۲۶) ناقص الطرفین نمبر ۱ آذر کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور -

(۲۷) نمبر ۱۱ کاتب فتح علی سنہ کتابت ۱۲۶۰ھ آذر کلیکشن - (ایضاً)

(۲۸) نمبر ۲۱ مجدول سرخ - جدید الخط (ایضاً) -

(۲۹) نمبر ۲۶ مجدول سرخ ۵۰ سمت کاتب نا معلوم (ایضاً) -

(۳۰) نمبر ۱۷ اوراق "بدر منیر" - اسے آذر صاحب نے اپنی فہرست میں دیوان میر تقی میر بہ خط مصنف لکھا ہے لیکن یہ "بدر منیر" کے اوراق ہیں - (ایضاً)

(۳۱) نمبر ۵۱۲ کاتب اقبال علی ۷ صفر ۱۲۸۰ھ شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور (بحوالہ فہرست ابوالخیر عبداللہ) -

(۳۲) نمبر ۶۹۳ - تاریخ ندارد (ایضاً) -

(۳۳) نمبر ۳۰۲ ۱ فروری ۱۸۱۷ء بہ خط بالکشن بہ مقام بنارس (ایضاً) -

(۳۴) ناقص الطرفین باعراب - نمبر ۱۸۶۲ - (ایضاً) -

(۳۵) مکمل نسخہ - اوراق ۹۲ شمارہ ۱۹۸۳ء -

(۳۶) نمبر ۲۸ ، ۶ ۵۱ - ۱۲۷۷ھ سے قبل کا نسخہ "نوبہار عشق" کے ساتھ ایک ہی جلد میں بندھا ہے[1] -

(۳۷) نمبر ۶۹ ، ۱۴۷ - کاتب میر محسن علی ۱۴ جمادی‌الاول ۱۲۴۳ھ بہ مقام حیدر آباد دکن (ایضاً) -

(۳۸) نمبر ۷۰ ، ۵۱۸ کاتب غلام حسین ۱۲۲۳ھ بہ مقام بیدر (ایضاً)

(۳۹) نمبر ۲۲۷ ، ۳۷۳ سنہ کتابت ۱۲۳۹ھ (ایضاً) -

(۴۰) (۴۱) (۴۲) کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں "سحر البیان" کے دو قلمی نسخے ہیں - ان میں ایک زیادہ قدیم خوش خط مطلا جو ۱۲۰۸ھ یعنی مصنف کی وفات کے سات سال بعد لکھا گیا - دوسرا بھی قدیم ہے جو مصنف کی وفات کے اکیس سال بعد ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں بہ مقام برہان پور مکتوب ہوا[2] - (برہان پوری نسخے کے) آخر میں حسب ذیل تاریخی قطعہ ہے - جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں پایا جاتا :

---

۱ - "تذکرۂ اردو مخطوطات" جلد اول مرتبہ محی‌الدین قادری زور - ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن کے کتاب خانے کی فہرست (دکن ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) -

۲ - اس کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی ہے - اس پر سنہ کتابت تحریر نہیں ، لیکن منشی شیر علی افسوس کا دیباچہ ہے - دیباچہ شروع سے مکمل ہے - لیکن کاتب نے آخر کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے - دیباچے کے خاتمے پر شعر درج ہے :

'یہ مہلت غنیمت ہے کرلے وہ کام
کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام'

مگر صاحبِ مہر کا نام پڑھا نہیں جاتا البتہ مہر پر ۱۲۳۷ھ لکھا ہوا ہے -

ہیں مرزا مغل میرے اک آشنا
یہ قصہ مجلا مرے پاس لا
کہا اس کو ٹک تم مطالعہ کرو
کہ اس کے معانی پہ تم دل دھرو
یہ کہہ کر حسن نے کہانی کہی
یہی سچ کہ ہے طور اس کی نئی
کہی اس کی تاریخ یاروں نے مل
کہ جو تھے وہاں سب کے سب اہل دل
میاں مصحفی و رفیق و شفیق (کذا)
کہ سید حسن کے ہیں دونوں رفیق
کہا تم کو ہے ذوق تاریخ کا
کہو خوش ہو تاریخ سے دل مرا
اس عاصی کو بھی ان کی خاطر عزیز
ہے خاطر سے بہتر نہیں کوئی چیز
سنو یارو اب مجھ سے تاریخ کو
برائے خدا اس کی ٹک داد دو
کہ تاریخ تعمیہ میں ہے یہ کمال
وہ غافل جو رکھتا ہے اس کا خیال
بنائے زکا حسن بدر منیر
کہ تاریخ قصہ کی ہے بے نظیر
ہزار آفرین اس کے ناظم کو ہو
الٰہی حسن کو رکھو سرخرو[1]

ان میں سے نسخہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کا ذکر مرتب فہرست کتاب خانۂ آصفیہ نے بھی کیا ہے "قلمی نمبر ۱۶۱ - سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ

---

۱ - بنائے زکا کہ الف است آں را دو کند و باقی عدد آں را گرفتہ یعنی عدد ز ۔ ک با عدد بے نظیر مخلوط سازد مدعا حاصل شود ۔ یعنی تاریخ بر می آید : زک بے نظیر ۱۱۹۹ھ - (دیباچۂ "رموز العارفین" ۔ طبع حیدر آباد صفحہ ۱۷ ، ۱۸) -

و قلمی نمبر ۳۳ ۱۲۷۶ھ کا قلمی نسخہ "گلزار نسیم"، "اندرسبھا" وغیرہ کے ساتھ ایک جلد میں بندھا ہوا ہے[1] ۔

(۴۳) ایک نسخہ "سحر البیان[2]" ۔

(۴۴) کتاب خانۂ سید وزیر الحسن عابدی میں "دیوان سودا" اور "مثنوی گل صنوبر" کے ساتھ "سحر البیان" کا ایک ناقص الآخر نسخہ ایک جلد میں بندھا ہے ۔

(۴۵) نمبر ۵ "سحر البیان" (قلمی) کتابت ۱۲۱۷ھ مصور نسخہ تعداد تصاویر ۳۹ - دکنی سکول کی تصاویر - (فہرست حیدر آباد کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی "نوائے ادب" اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۴۲، ۴۳) -

(۴۶) نمبر ۶ بہ خط نستعلیق دکھنی سکول کی ۵۰ تصاویر (فہرست حیدر آباد کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی "نوائے ادب" اپریل صفحہ ۴۴)[3]

(۴۷) نمبر ۶ بہ خط نستعلیق دکھنی سکول کی ۱۰ تصاویر (فہرست حیدر آباد کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی نوائے ادب اپریل صفحہ ۴۴) -

(۴۸) گارسین دتاسی کے کتاب خانے میں "سحر البیان" کا ۱۸۹۵ء کا مکتوبہ نسخہ موجود تھا[4] ۔

(۴۹) کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (علی گڑھ) میں "سحر البیان" کا ایک نسخہ ہے - [نمبر ۳/۳۳ ۸۹۱۶۵۵۱] کاتب غلام محمد خاں بہادر فرزند امام الملک مرحوم و مغفور سال کتابت ۱۲۴۹ھ اوراق ۸۰ ابتدا میں نثر اردو کا وہ مقدمہ بھی ہے جو شیر علی افسوس نے لکھا ہے - اس کا ابتدائی

۱ - فہرست کتاب خانہ آصفیہ سرکار عالیہ ۱۳۳۳ھ جلد دوم صفحہ ۱۴۹۶
۲ - اسپرنگر صفحہ ۶۰۹ نمبر ۶۲۵—H -
۳ - کتاب خانہ نواب سالار جنگ میں کئی با تصویر نسخے ہیں - (ہاشمی صفحہ ۴۳) -
۴ - "نوائے ادب" (بمبئی) جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۳ -

ورق موجود نہیں ۔ الفاظ مشکول و مضبوط یعنی زبر زیر وغیرہ کا التزام ہے ۔ حاشیے پر کاتب نے مندرجہ ذیل مثنوی نقل کی ہے ۔ پہلے اور آخری شعر یہ ہیں :

دل سوزاں دے اور دے چشم پر نم
رکھ ایسی آب و آتش میں مرا دم
الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ
انھوں کو دو جہاں میں سرخرو رکھ[1]

(۵۰) پنجاب پبلک لائبریری میں نمبر ۱ ظ ۱۳۹ (۲) ۳۴ ، ۸۵۱ مث ، مثنوی میر حسن کرم خوردہ لوح زرد اور سرخ رنگوں سے معمولی نستعلیق میں ۔ آخر میں ترقیمہ درج ہے ۔ کاتب کا نام الٰہی بخش جو عطر سنگھ کا متوسل تھا ۔ سنہ ہجری ۱۲۳۰ھ درج ہے ۔

(۵۱) مثنوی میر حسن دہلوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ) ضمیمہ یونیورسٹی اردو ادب : ۲ اوراق ۱۳۷ سطور : ۱۵ ۔ مکتوبہ عبدالستار حسن دین در ۱۲۶۱ء ۔ یہ نسخہ مصور ہے ، تصویریں معمولی ۔

(۵۲) مثنوی میر حسن دہلوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ) ضمیمہ یونیورسٹی ادب اردو : تعداد اوراق مندرج نہیں سطور : ۹ خوش خط ۔ پہلا صفحہ ناقص ۔ آخری شعر :

معلم اتالیق و منشی ادیب ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب

پھر تصویر بنانے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی ہے ۔ نام کاتب وغیرہ درج نہیں ۔

(۵۳) متفرق اوراق (مملوکہ خلیل الرحمان داؤدی) قرائن سے معاصر نسخہ معلوم ہوتا ہے ۔

سحر البیان "مثنویات حسن" کی دوسری جلد میں شامل ہے یہ اشاعت "سحر البیان" کا اولین مطبوعہ نسخہ تو نہیں لیکن ہمارے متن کی اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ میر حسن کے اپنے مسودے پر مبنی ہوگا ۔ مثنوی

۱ ۔ بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختارالدین احمد مورخہ ۱۶ جون ۱۹۵۸ء ۔

کی لاتعداد اشاعتیں موجود ہیں ان میں ۳۸ اشاعتوں کا حال معلوم ہے وہو ہذا :

نمبر		سنہ ہجری سنہ عیسوی	
۱	مثنوی ترجمہ بہادر علی حسینی	۱۸۰۳ء	اوراق ۵۸ - دتاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸ -
۲		۱۸۰۳ء	طبع ثانی ، سائز حروف ٹائپ 4° [ایضاً]
۳	سحرالبیان	۱۸۰۵ء	فورٹ ولیم کالج ایڈیشن - تعداد اوراق ۱۹۶ دتاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ بعد -
۴	"	۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء	مطبع طبّی ناشر، عبدالماجد ، "سحرالبیان" مع دیباچہ افسوس سرنامے پر لکھا ہے کہ یہ مثنوی پانچ دفعہ پہلے بھی چھپ چکی ہے [دیباچہ "رموز العارفین" - سید احمد اللہ قادری صفحہ ۱۶] -
۵	سحرالبیان	۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء	لکھنؤ - مصطفائی پریس - ۱۰۸ صفحات ہر صفحے پر ۲۱ شعر - لیتھو - باڈلین لائبریری کٹالاگ
۶	"	۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء	لکھنؤ مسیحائی پریس - لیتھو [ایضاً]
۷	"	۱۸۵۰ء	بمبئی
۸	"	۱۸۵۰ء	دہلی بعنوان بدر منیر [باڈلین کٹالاگ و دتاسی]
۹	"	۱۸۵۰ء	میرٹھ بعنوان مثنوی میر حسن [ایضاً]

۱۰	"	۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء	کانپور - مطبع جعفری -
۱۱	منشور ترجمہ حسینی	۱۸۶۲ء	طبع ثالث - مرتبہ - Lees سائزحروف 8° [دتاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸]
۱۲	سحر البیان	۱۸۶۲ء	کانپور -
۱۳	"	۱۸۶۳ء	آگرہ - دیوناگری حروف میں - سائز حروف ۸° - [دتاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ بعد] -
۱۴	"	۱۸۶۴ء	لکھنؤ -
۱۵	انگریزی ترجمہ از سی ڈبلیو باؤڈلر بیل (C. W. Bowdler Bell)	۱۸۷۱ء	کلکتہ
۱۶	سحر البیان	۱۸۷۴ء	کانپور
۱۷	"	۱۸۷۶ء	میرٹھ
۱۸	"	۱۸۷۸ء	کانپور
۱۹	"	۱۸۷۹ء	سیتاپور
۲۰	ڈرامہ سحرالبیان (رونق)	۱۸۷۹ء	گجراتی زبان میں - (باڈلین کٹالاگ)
۲۱	سحر البیان	۱۸۸۲ء	لکھنؤ (نول کشور پریس)
۲۲	انگریزی ترجمہ کورٹ	۱۸۸۹ء	کلکتہ طبع ثانی - دی نثر بے نظیر - ایم - ایچ - کورٹ بہادر علی حسینی کی نثر کا ترجمہ (ضمیمہ کٹالاگ برٹش میوزیم صفحہ ۱۲۱)
۲۳	خمسہ باطن	۱۸۹۲ء	
۲۴	انگریزی ترجمہ (کورٹ)	۱۸۹۵ء	
۲۵	" " (رینکنگ)	۱۹۰۱ء	کلکتہ

۲٦	سحر البیان	۱۹۰۸ء	مخزن پریس دہلی
۲۷	”	۱۹۱۸ء	لکھنؤ - نول کشور پریس
۲۸	”	۱۹۲۵ء	“
۲۹	”	۱۹۳۱ء	لکھنؤ - مرتبہ آسی (ترقیمہ - مطبع ہذا میں بارھویں بار سحر البیان کا نسخہ چھپا)
۳۰	”	۱۹۳۳ء	“
۳۱	”	۱۹۲۹ء	مرتبہ حامداللہ افسر -
۳۲	سحر البیان	۱۹۳۷ء	لکھنؤ - مرتبہ شمس بریلوی
۳۳	”	...	اردو مرکز لاہور
۳۴	”	؟	مطبع مسیحائی شاہدرہ دہلی - مبنی بر نسخہ مطبع نظامی، واقع کانپور - قرائن سے انیسویں صدی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے - مہتمم محمد عبدالرحمان عرف رحمان بخش بہ عنوان "سحرالبیان" طبع ہوا - مطبوعہ نسخہ کے آخری اوراق غائب ، تعداد اوراق ۳٦
۳۵	سحرالبیان	؟	نسخہ مملوکہ خلیل الرحمان داؤدی ناقص الاول تعداد صفحات ۵٦ مصور نسخہ ، مطبع کا نام ندارد آخر میں آغاز حال مصنف کے تحت شیر علی افسوس کے دیباچے سے حالات کا خلاصہ دیا ہے صفحہ ۵ پر شاہ عالم کی شبیہہ اور صفحہ ٦ پر آصف الدولہ کی شبیہہ دی ہے - جو میر محمد زائر کی "قیصر التواریخ"

			کی طبع ثانی میں درج ہے - عجب نہیں نول کشور پریس کی کوئی اشاعت ہو - (نسخہ مملوکہ خلیل الرحمان داؤدی) -
۳۶	مثنوی میر حسن باتصویر	؟	نول کشور پریس - سر ورق پر میر حسن کی تصویر صفحات ۵۲ آخری ورق غائب - پنجاب پبلک لائبریری نمبر ۸۵۱ء۳۳ مث (تصاویر خلیل الرحمان داؤدی صاحب کے نسخے سے مختلف ہیں) -
۳۷	"	؟ ؟	در طبع میرٹھ پریس بہ طبع مزین مطبوع اطباع اہل جہاں شد - سر ورق پر میر حسن کی قلمی تصویر صفحات ۹۶ آغاز میں حال مصنف مشتمل چار سطروں پر (مبنی بر دیباچۂ شیر علی افسوس) پبلک لائبریری نمبر پ ۲۴۴۳ - ۳۴ و ۸۵۱ مث -
۳۸	مثنوی سحرالبیان	۱۹۵۲ء	خواجہ بک ڈپو اردو بازار لاہور - صفحات ۱۳۳ پبلک لائبریری نمبر ۲۴۴۳ پ ۳۴ و ۸۵۱ سحر -

ان میں سے نسخۂ "مثنویات حسن" مرتبہ آسی (ناشر : نول کشور ۱۹۴۳ء) "مثنویات میر حسن" (مخزن پریس دہلی ، ۱۹۰۸ء) اور "سحرالبیان" مرتبہ شمس بریلوی (۱۹۴۷ء) قابل ذکر ہیں -

(۴)

پہلی جلد کی گیارہ مثنویوں میں صرف "گلزار ارم" اور "رموزالعارفین" کے آخر میں سنہ تکمیل درج ہے باقی مثنویوں کی زمانی ترتیب بعض قرائن اور چند ایک داخلی شہادتوں پر منحصر ہے - "نقل کلاونت"، "نقل زن فاحشہ"

کا متن نسخہ الف سے تیار کیا گیا ہے اور اس سے قبل یہ مثنویاں کہیں شائع نہیں ہوئیں - ان میں بعض ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جنھیں فحش سمجھا جائے گا ایسے الفاظ کے شروع اور آخر کے حروف درج کیے گئے ہیں اور جتنے حرف نظری کیے ہیں اتنے نقطے درمیان میں لگا دیے ہیں - یہی صورت "نقل قصاب برائے تصریح مزاج (ہجو قصائی)" اور "نقل قصائی" کی ہے - ان دو آخرالذکر مثنویوں کا متن نسخۂ الف کے علاوہ شاہ کمال کے تذکرے "مجمع الانتخاب" پر منحصر ہے اور یہ چاروں مثنویاں سنہ تکمیل کے اندراج کے بغیر ہیں - بندشوں کی سستی اور دیگر شعری اسقام کی بنا پر انھیں حسن کی ابتدائی کوششیں قرار دینا موزوں معلوم ہوتا ہے -

حسن کی تصانیف میں "مثنوی شادی آصف‌الدولہ" پہلی قابل ذکر شعری تخلیق ہے جس میں اس کی صلاحیتیں بروئے کار آتی دکھائی دیتی ہیں - اس میں بعض images بلاشبہ "سحرالبیان" کا پیش خیمہ نظر آتی ہیں - داخلی شواہد سے حسن کی اہم تصانیف میں یہ قدیم ترین شمار کی جا سکتی ہے - اس میں شجاع‌الدولہ کا ذکر بہ طور زندہ شخص کے کیا گیا ہے - مثنوی کی تقریب شجاع‌الدولہ کے حین حیات میں آصف‌الدولہ کی شادی ہے - تاریخوں سے رجوع کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۸۳ھ میں پیش آیا -[۱] اس لیے مثنوی کی تحریر کا زمانہ ۱۱۸۳ھ قرار دینا چاہیے - مثنوی اس سے قبل مکمل طور پر دو بار شائع ہوئی ہے - رسالہ "معیار" پٹنہ مارچ ۱۹۳٦ء میں قاضی عبدالودود صاحب نے اسے شائع کیا بعد میں رسالہ "معاصر" پٹنہ کے حصہ اول میں "ایک انگریز مستشرق کا سرقہ" کے عنوان سے دوبارہ چھپی - اب تیسری بار زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے -

مثنوی شادیٔ آصف‌الدولہ کے بعد زمانی ترتیب سے مثنوی "رموزالعارفین" آتی ہے جس میں تکمیل ۱۱۸۸ھ درج ہے:

جب بھرا در معانی سے یہ طشت
تھے ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ مثنوی مکمل طور پر کبھی شائع نہیں ہوئی! اس خیال کا اظہار انھوں نے "معارف" اکتوبر ۱۹۴۳ء

---

۱ - "لکھنؤ کا دبستان شاعری" (ابواللیث صدیقی) متعلقہ صفحات -

میں بھی کیا تھا چنانچہ اس کے جواب میں کلب علی خاں فائق رام پوری نے رسالہ "تصویر" رام پور (جلد نمبر ۔ ۲ فروری ۱۹۴۴ء مقالہ بہ عنوان "میر حسن کی مثنوی") میں مندرجہ ذیل اشاعتوں کی اطلاع دی[1] ۔

(۱) مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۷ھ ۔

(۲) مطبع کانپور کا نسخہ جس میں "مثنوی قصیدۂ غوثیہ"، "قصۂ محمود شاہ"، "پند طاہر"، "اعزاز نامہ" اور "قصۂ شاہ روم" بھی شامل تھے ۔

(۳) مطبع کریمی بمبئی ۱۳۲۶ھ[2] ۔ "عبرت نامہ" ۔ "قصیدہ غوثیہ"۔ "قصۂ محمود شاہ" ۔ "پند طاہر" ۔ "اعزاز نامہ" اور "اللہ بس باقی ہوس" کے ساتھ طبع ہوا ۔ یہ نسخہ دوسرے نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اشعار دونوں کےمطابق ہیں۔ "شعرالہند" میں جو اشعار مثنوی کے درج ہیں مطبوعہ نسخے میں اس کے خلاف درج ہیں اور اس اختلاف میں دونوں نسخے متفق ہیں ۔

اس مثنوی کے اور مطبوعہ نسخے بھی ہیں :

(۴) نول کشور پریس سے مولانا عبدالباری آسی نے "مثنویات میر حسن" کے زیر عنوان "سحر البیان" کے ساتھ اسے بھی شائع کیا[3] ۔

(۵) حیدر آباد دکن ۱۳۲۵ھ میں سید احمد اللہ قادری صاحب نے شائع کی اس ایڈیشن کی کیفیت یہ ہے :
"دیباچہ" صفحہ ۱ تا ۴۲ "دیباچۂ افسوس" صفحہ ۴۲ تا ۲۸ "تعلیقات" صفحہ ۲۸ ماخذ صفحہ ۲۹ تا ۳۰ "رموزالعارفین" صفحہ ۱ تا ۱۱ ۔

(۶) مطبع مجتبائی واقع دہلی میں مولوی عبدالواحد کے اہتام سے

---

۱ ۔ رسالہ "تصویر" صفحہ ۴۲ ۔ ۳۰ ۔

۲ ۔ بار اول کا نوٹ ٹائیٹل پر ہے ۔

۳ ۔ "مثنویات حسن" ایڈیشن ۱۹۴۴ھ صفحہ ۱۶۳ تا ۲۰۳ ۔

۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی - صفحات ۳۲ - سر ورق پر لکھا ہے کہ مع اضافہ حکایات صالحین مناجات[1]

(۷) مطبع نامی واقع لکھنؤ میں قطب الدین احمد کے اہتمام سے ماہ جون ۱۸۹۲ء (۱۳۰۹ھ) شائع ہوئی - نسخہ مطبوعہ جو پیش نظر ہے ناقص الآخر ہے - کل ۲۰ صفحے موجود ہیں متن مطبع مجتبائی کے عین مطابق ہے - ہر صفحے پر تعداد اشعار بھی وہی ہے - مکمل صورت میں ۳۲ صفحات پر مشتمل ہوگا[2]

کلیات میں شامل متون سے قطع نظر "مثنوی رموزالعارفین[3]" کے دو جداگانہ قلمی نسخوں کا بھی پتا چلتا ہے :

(۱) جدید الخط نسخہ مملوکہ سید احمد اللہ -

(۲) خوش خط مخطوطہ مملوکہ سید محمد حسین بلسگرامی سابق صدر محاسب سرکار عالی - مکتوبہ ۲۱ محرم ۱۲۰۳ھ[4] -

گارسیں دتاسی نے قصہ کام روپ کے ساتھ حسن کی ایک اخلاق نظم کو شائع کیا جس میں اخلاق خیالات تھے[5] معلوم نہیں یہ رموز کا کوئی ٹکڑا تھا یا کسی اور مثنوی کی ابتدائی مناجات -

"مثنوی ہجو در حویلی کہ بر کرایہ گرفتہ بود" قرائن سے ۱۱۸۹ھ اور ۱۱۹۰ھ کے قریب قرار دی جا سکتی ہے جب حسن نے سالار جنگ کی معیت میں فیض آباد سے لکھنؤ آ کر رہائش اختیار کی - مؤخر بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض آباد میں حسن کا ذاتی مکان محلہ گلاب باڑی میں

---

۱ - نسخہ مملوکہ خلیل الرحمان داؤدی -

۲ - ایضاً -

۳ - دیباچہ "رموز العارفین" (مرتبہ سید احمد اللہ) صفحہ ۲۱ -

۴ - ایضاً -

۵ - "تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی" از گارسیں دتاسی (بزبان فرانسیسی) جلد اول صفحہ ۵۲۸ بیعد و "تمہیدی مقالات" از گارسیں دتاسی (اردو ترجمہ) صفحہ ۷۶، ۷۷ -

واقع تھا - اس لیے یہ کرائے کی حویلی جس کی مذمت کی گئی ہے لکھنؤ ہی میں ہوگی - اسلوب بیان کی پختگی اور محاکات پر قدرت بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ نظم حسن کی ابتدائی مشق کا نتیجہ نہیں بلکہ اس زمانے کی یادگار ہے جب وہ نو مشقی کی منزل سے گزر کر کہنہ مشقی کے زمانے میں آ چکا تھا - اس لیے "ہجو حویلی" کو ۱۱۸۹/۱۱۹۰ھ کی مثنوی جاننا چاہیے - رسالہ "افکار" کراچی شمارہ ۱۵۵ جولائی ۱۹۶۳ء میں پہلی بار مکمل طور پر شائع ہوئی - اب اسے دوسری بار پیش کیا جا رہا ہے - اس میں میر حسن نے اپنا دہلی سے سفر ، ڈیگ اور مکن پور میں قیام ، لکھنؤ میں ورود اور پھر فیض آباد میں رہائش کا حال لکھا ہے اور آخر میں اپنے لکھنؤ آ کر بس جانے کا ذکر کر کے ۱۱۹۲ھ میں اسے ختم کیا ہے - یہاں حسن کا بیانیہ انداز نکھر گیا ہے اور "سحرالبیان" کے فنی خصائص کی اولیں جھلک اس میں پورے طور پر نظر آتی ہے - مثنوی کی تالیف کا سنہ " گلذار ارم " کے اعداد سے نکلتا ہے اور اس میں شاعر نے اپنے زمانے کے عام رواج کے مطابق گلزار کو 'ز' کی بجائے "ذ" سے لکھا ہے اور 'ذ' کے اعداد ہی سے تاریخ بر آمد کی ہے - متعلقہ شعر یہ ہے :

ز بس وصف گل و گلشن بہم ہے
سو اس کا نام "گلذار ارم" ہے

۱۱۹۰ھ

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی ایک بار شائع ہوئی ، یہ درست نہیں - کم از کم دو بار یہ مثنوی شائع ہو چکی ہے :

۱ - مخزن پریس دہلی (۱۹۰۸ء) "مثنویات حسن" کے زیر عنوان "سحرالبیان" کے ساتھ شائع ہوئی صفحات ۹ - ۱ تا ۱۶۷ -

۲ - نول کشور پریس سے ۱۹۳۳ء/۱۹۳۵ء میں "سحرالبیان" اور "رموز العارفین" کے ساتھ شائع ہوئی صفحات ۱۳۳ تا ۱۶۲ -

" مثنوی در تہنیت عید " ، " مثنوی در وصف قصر جواہر " اور "خوان نعمت" تینوں ۱۱۹۹ھ کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں -

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "مثنوی تہنیت عید" کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں :

"غالباً ۱۱۹۲ھ کے بعد کی تصنیف ہے ... اس میں جواہر خاں (کذا) کی تعریف ہے جو آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کے ناظر اور میر حسن کے خاص محسنوں میں تھے - ۱۱۹۲ھ کے بعد کی قید یوں لگائی گئی ہے کہ "تذکرۂ میر حسن" سنہ مذکور میں مکمل ہوا - اس میں میر حسن اپنے صرف دو ممدوحوں کا ذکر کرتے ہیں ... بعد کی مثنویوں میں جواہر خاں (کذا) کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے اب انھیں کے دامن سے وابستہ ہوں ... مثنوی (قصر جواہر) ۱۱۹۲ء اور ۱۱۹۷ھ کے درمیان لکھی گئی[1] "۔

آصف الدولہ اور اس کی والدہ کے تعلقات ۱۱۸۸ھ کے اواخر ہی سے کشیدہ ہونے شروع ہو گئے تھے اور انتہائے عروج چپقلش ۱۱۹۶ھ ہے۔ جب جواہر علی خاں اور بہار علی خاں گرفتار کر لیے گئے[2] - ۲۰ محرم ۱۱۹۶ھ میں انھیں گرفتار کر کے آصف باغ میں رکھا گیا - ۸ رجب کو دونوں لکھنؤ لے جائے گئے - رمضان ۱۱۹۷ھ میں دونوں اسیر ہی رہے - جب وارن ہسٹنگز بنارس کی طرف آیا تو آصف الدولہ اس سے ملنے کے لیے گیا اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیتا گیا - اس کے بعد آصف کا انداز بدل گیا - وہ خواجہ سراؤں کو واپس بھیجتا ہے اور اب چاپلوسی کا رستہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ بیگمات اودھ سے جو بگاڑ ہوا تھا ٹھیک ہو جائے - اس طرح جواہر علی خاں کی مدح کا موقع ۱۱۹۸ھ اور ۱۲۰۱ھ کے درمیان نکل سکتا ہے ، اس سے پہلے نہیں - مثنوی تہنیت عید کا پہلا شعر ہے :

فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید
کہ دو سال ہو مجھ کو بنگلے میں عید[3]

---

۱ - "لکھنؤ کا دبستان شاعری" صفحہ ۱۰۳ ، ۱۰۴ -
۲ - بہ حوالہ "تاریخ فرح بخش" -
۳ - مثنوی ہذا - معیار مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۴۴ -

شعر کا مطلب یہ ہے کہ فلک کج رفتار کے ظلم کی وجہ سے (خاصے عرصے سے ؟) فیض آباد میں (مسلسل) دو سال عیدیں کرنا (یا پچھلے دو سال سے عیدیں کرنا) نصیب نہیں ہوا - اس مثنوی میں عیدالفطر کا ذکر ہے جو قمری حساب سے یکم شوال کو ہوا کرتی ہے - میر حسن نے فیض آباد میں آ کر عید گزاری اور سات دن یہاں قیام کیا - آگے چل کر ایک شعر ہے :

ز بس اب کے ساون میں آئی ہے عید
سو ہے یہ گہر بار سال سعید[1]

"اب کے" اور "ساون" قابل غور ہیں - یہ ایسی عیدالفطر ہے جو پہلی دفعہ ساون کے مہینے میں آئی ہے - تقویم سے رجوع کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کی زندگی میں ساون کے مہینے میں عیدالفطر پہلی دفعہ یکم شوال ۱۱۶۴ھ پنجشنبہ کے دن (۱۲ اگست ۱۷۵۱ء) ہوئی اور پھر ساون کے مہینے میں ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۶۶ھ کو بھی عیدیں ہوتی رہیں ؛ جب کہ میر حسن ابھی دلی ہی میں تھے - ساون کی عیدوں کا دوسرا چکر یکم شوال ۱۱۹۹ھ [یک شنبہ] مطابق ۷ اگست ۱۷۸۵ء سے شروع ہوتا ہے - دوسری ساون کی عید یکم شوال ۱۲۰۰ھ [سہ‌شنبہ] (۱۷ جولائی ۱۷۸۶ء) کو اور تیسری عید ۱۲۰۱ھ میں ہوتی ہے - ۱۲۰۱ھ خارج از بحث ہے کیونکہ میر حسن اس سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں - ۱۲۰۰ھ کی عید اگر لی جائے تو "اب کے" کا ٹکڑا بے کار ہو جاتا ہے - اس لیے ہمارے خیال میں یہ مثنوی "تہنیت عید" ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی - اب ایک اور لحاظ سے اسے دیکھنا چاہیے - مثنوی "تہنیت عید" میں ایک شعر ہے :

پڑا مہر سے سایۂ بوتراب
کہ برج اسد میں گیا آفتاب

جب برج اسد میں آفتاب ہو تو ساون کے مہینے میں یہ عید آتی ہے - ایسا ممکن ہے کیونکہ ذوق کہتے ہیں (اشعار قصیدۂ ہفدہ زبان) :

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

---

۱ - ایضاً صفحہ ۱۴۳ -

جوش روئیدگیٔ سبزہ بہ یاد آتی ہے
آیت انبتہ اللہ نباتاً حسناً

جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوس خیال
خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیر کفن[1]

"مثنوی در تہنیت عید" کو پہلی بار قاضی عبدالودود صاحب نے مرتب کر کے مئی ۱۹۳۶ء میں "معیار" (پٹنہ) میں شائع کیا[2] "مثنوی در وصف قصر جواہر" بھی اس سے قبل دو قسطوں میں "معیار" (پٹنہ) میں شائع ہوئی[3] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے "ادب لطیف" میں غیر مطبوعہ مثنوی کے طور پر حال ہی میں شائع کیا ہے ؛ لیکن ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ۔

میر حسن آخری زمانے میں مالی لحاظ سے پریشان تھے ۔ ان کے آقا سالار جنگ ان دنوں زیر عتاب اور مالی لحاظ سے پریشان حال تھے ۔ اس لیے "سحرالبیان" کا انتساب بھی آصف‌الدولہ کے نام پر ہوا ۔ ان کی شان میں لکھے گئے قصائد بھی ۱۱۹۹ھ ہی کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں ۔ مثنوی "خوان نعمت" کو بھی اسی دور کی چیز تسلیم کرنا چاہیے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کا متن ماہ نو اکتوبر ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ۔

۱ ۔ "دیوان ذوق" مرتبہ آزاد صفحہ ۳۵۲ ۔
۲ ۔ معیار (پٹنہ) (مئی ۱۹۳۶ء) صفحہ ۱۴۴ ، ۱۴۵ ۔
۳ ۔ معیار (پٹنہ) (جون جولائی ۱۹۳۶ء) صفحات علی‌الترتیب ۲۵۱ تا ۲۵۴ اور ۳۰۵ تا ۳۱۰ ۔

جہاندار شاہ

(۱)

شہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ خانوادۂ تیموری سے تھے ۔ یہ پاک و ہند کے ان معدودے چند خاندانوں سے ہے جس نے رزم و بزم دونوں میدانوں میں داد شجاعت دی ۔ کشور کشائی اور انتظامی صلاحیت کے علاوہ علم و فضل کی سرپرستی اور شعر و ادب کا بلند ذوق رکھنے کی وجہ سے تاریخ ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ دودمان تیموری کے فرزندوں نے صرف علم و ادب کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ ان میں کئی ایسے جلیل‌القدر صاحب سیف و قلم ہو گزرے ہیں جن کے کارنامے ترکی ، فارسی اور اردو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ بابر کی توزک اور ترکی دیوان اس کی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا ثبوت ہے ، ہمایوں کی ریاضی و نجوم سے واقفیت اور فارسی زبان و ادب میں دسترس کا حال بھی کسی سے مخفی نہیں ۔ شہزادہ کامراں کا فارسی دیوان ادب کے قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے ۔ گل بدن بیگم کا 'ہمایوں نامہ' اپنے دل کش اسلوب اور گراں قدر معلومات کی وجہ سے آج بھی خاصے کی چیز ہے ۔ جہاں گیر کی توزک پاک و ہند کے فارسی سرمائے میں وقیع مقام کی حامل ہے ۔ شاہ جہان کے مکتوبات بھی بیاضوں اور مجموعوں میں پائے جاتے ہیں ۔ دارا شکوہ کی "سر اکبر" "سفینۃ الاولیاء" اور "سکینۃ الاولیاء" کے علاوہ منظوم فارسی کلام کی بھی خاصی مقدار موجود ہے ۔ رسالۂ "حق نما" ، "مجمع البحرین" مثنویاں بھی اہمیت رکھتی ہیں ۔ جہاں آرا بیگم کی "مونس ارواح" بھی اس کے اعلیٰ نثری ذوق کی آئینہ دار ہے ۔ اورنگ زیب کے خطوط فارسی نثر کے اعلیٰ نمونے شمار کیے جاتے ہیں ۔ اس کی صاحب زادی زیب‌النسا کی منشات کا ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ سلسلۂ تصنیف و تالیف صرف دور عروج تک محدود نہیں بلکہ اورنگ زیب کے بعد بھی مغل فرماں رواؤں نے فارسی اور ترکی ادب کی آبیاری جاری رکھی ۔ ان ادیب فرماں رواؤں میں شاہ عالم ثانی کا نام فارسی ، ہندی اور اردو شعر و ادب میں اونچا مقام رکھتا ہے ۔

ان کا ہندی دیوان "نادرات شاہی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے - اردو دیوان ناپید ہے لیکن تذکروں میں اشعار پائے جاتے ہیں - فارسی دیوان کے قلمی نسخے بھی بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں - "عجائب القصص" (اردو نثر) بھی زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہے اور اس نادرۂ روزگار شاعر اور نثرنگار کے مرتبے کی شاہد ہے - یہ سلسلۂ تصنیف و تالیف اس کے فرزندوں جہاں دار شاہ اور سلیمان شکوہ پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اظفری گورگانی "واقعات اظفری" (نثر) اور دیوان ریختہ، مرزا حسن بخت، مرزا فرخندہ بخت جہاں شاہ قمر تخلص، شہزادہ قادر بخش صابر (صاحب "گلستان سخن"— تذکرۂ شعرا) اور ریاض قادر (دیوان اردو) اور ابو ظفر بہادر شاہ ("کلیات ظفر" چار جلدوں میں) بھی اسی خانوادے کے چشم و چراغ اور شعر و ادب کے متوالے تھے - فارسی کا ذوق اس خاندان میں آخر تک قائم رہا - ترکی میں مہارت کی داستان محمد شاہ پر آکر ختم ہو گئی - اردو شعر و ادب کا زور آخر زمانے میں آکر البتہ بڑھ گیا - شاہ عالم اور اس کے فرزندوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں - جہاں دار شاہ نے بے انتہا مصروف سیاسی زندگی بسر کی، اس کے باوجود اسے اردو شاعری سے لگاؤ تھا اور فارسی میں بھی بند نہ تھا - اس کا اردو دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سے اس کی شعری صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے -

(۲)

جہاں دار شاہ کی تاریخ پیدائش کا صحیح طور پر علم نہیں - فرینکلن نے ۱۷۴۰ء (۱۱۵۳ھ) کے لگ بھگ قرار دی ہے[1] لیکن اظفری نے "واقعات اظفری" میں لکھا ہے :

> "حاکم آن وقت محمد محی الملت ولد محی السنتہ ابن محمد کام بخش خلف خورد ترین حضرت خلد مکان را از قید نو محلۂ قلعۂ مبارک بر آوردہ بادشاہ کردند... چون فوج جنوب یعنی بھاؤ و وسواس راؤ رسیدلد از نوشت و خوائد و فہمانیدن جناب ایشان (مرزا بابا)

1. History of Shah Aulum (Franklin) ed. 1798 Page 12.
جہاں جہاندار کی وفات کے وقت اسے ۴۸ ویں سال میں بتایا گیا ہے -

جنوبیان مسطور شاہ جہان ثانی (محی الملت) را دستگیر نمودہ باز بہ قلعۂ مبارک در نو محلہ بدستور قید نمودہ و میرزا جوان بخت جہان دار شاہ موصوف و مغفور کلان پسر بادشاہ جمجاہ را کہ ہفت ہشت سالہ عمر داشتند معہ جناب ایشان باز از نو محلۂ مسطور بر آوردہ از طرف شاہ عالم بادشاہ کہ در آن زمان در بلدۂ الہ آباد مخیم سرادقات دولت علیا بود، ولی عہد نمودہ و نواب زینت محل مادر علاق بادشاہ را در محل معلیٰ سردار و مختار خان...را ناظر کل گردانیدہ بر ڈیوڑھیٔ بادشاہی و سلاطین و بیگمات مختار ذی اقتدار و بہ جناب ایشان ولی عہد بہادر را سپردہ نمودہ[۱]۔

۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں اگر جہاں دار شاہ سات آٹھ برس کے تھے تو ان کی پیدائش ۱۱۶۶ھ کے گرد و پیش شمار ہونی چاہیے۔ امتیاز علی خاں عرشی تقریباً ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء قرار دیتے ہیں[۲] جہاں دار کے والد عالی گوہر (شاہ عالم) ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب آن کے والد عزیزالدین (عالم گیر ثانی) فرخ سیر کی قید میں تھے اور ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ - ۲ جون ۱۷۵۴ء کو جب عماد الملک نے عزیزالدین کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا تو انھیں بھی رہائی حاصل ہوئی۔ اس طرح گویا جہاں دار کی پیدائش کا زمانہ نظر بندی کا دور ہی ہے۔ ان بیانات میں فرینکلن کا دیا ہوا سنہ مشکوک نظر آتا ہے۔ جہاں دار کی پیدائش کے سلسلے میں تین دلائل کو سامنے رکھنا ضروری ہے[۳]:

---

۱ - "واقعات اظفری"، اظفری، قلمی، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور - ورق ۹۶ الف -

۲ - "نادرات شاہی" (شاہ عالم) مرتبہ عرشی، دیباچہ صفحہ ۵۰ -

۳ - ایک قرینہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ۱۱۷۴ھ میں جہاں دار اتنی عمر کے تھے کہ باپ سے الگ سوتیلی دادی کے پاس رہ سکیں لیکن یہ دلیل اس لیے باطل ہے کہ نواب زینت محل کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اور انھوں نے جہاں دار شاہ کو اس کی پیدائش پر ہی گود لے لیا تھا، دیکھیے "واقعات اظفری" ورق ۹۶ الف -

۱ - ۱۱۷۳ھ میں جب انھیں احمد شاہ ابدالی نے ولی عہد سلطنت مقرر کیا تو تیموری شہزادے مرزا بابا (محمد علاء الدولہ بہادر) ان کے معین و مددگار تھے - جہاں دار کی کم عمری کے سبب مرزا بابا کو لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ خود حکومت پر قابض ہو جائیں - اس لیے اس وقت شہزادے کی عمر شعور کی حد میں نہ ہونی چاہیے[1] -

۲ - جہاں دار شاہ اپنے باپ شاہ عالم کی اودھ سے واپسی (۱۱۸۵ھ) پر مرزا بابا کی لڑکی سے بیاہے گئے - اس وقت وہ اس عمر کو پہنچے تھے کہ ان کی شادی کر دی جائے۔

۳ - جہاں دار نے ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا - "طبقات الشعرا" (شوق) میں ان کا ذکر بصیغۂ ماضی درج ہے لیکن انھیں جوانا مرگ بتایا گیا ہے[2] "عمدۂ منتخبہ" کے مؤلف نے بھی اس کی تائید کی ہے - عشقی نے بہ صراحت لکھا ہے کہ آغاز جوانی میں انتقال کیا[3] اس لحاظ سے انتقال کے وقت ان کی عمر بہر حال چالیس برس سے کم شمار ہونی چاہیے -

اس استدلال کی روشنی میں فرینکلن کی بیان کردہ تاریخ قابل قبول نہیں - عجیب بات ہے کہ عبدالعلی نے ایک طرف تو فرینکلن کا بیان کردہ سنہ پیدائش اختیار کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں دار کی ابتدائی تعلیم و تربیت اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی[4] حالانکہ قید و بند میں اعلیٰ تعلیم یا تربیت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور جہاں دار کی خاطرخواہ تعلیم و تعلم کی نوبت حراست کے مصائب سے نکل کر ہی آئی ہو گی -

انتقال کے وقت جہاں دار کی عمر ۴۰ برس ہی فرض کی جائے تو پیدائش ۱۱۶۱ھ کے گرد و پیش ہوتی ہے - ۱۱۷۳ھ میں عمر ۱۱ برس، ۱۱۷۳ھ

۱ - "نادرات شاہی" 'عرشی' دیباچہ -
۲ - "طبقات الشعرا"، ترجمہ ۱۵۲ -
۳ - اقتباسات آگے مناسب مقام پر درج ہے -

4. Indian Historical Records Commission Proceedings of Meetings Vol. XIV Dec. 1937 ; Prince Jawan Bakht Jahandar Shah (A.F. M. Abdul Ali F.R.S.L.M., M.A.) Page 138.

میں ۱۵ برس اور ۱۱۸۵ھ میں ۲۶ برس ہو جاتی ہے۔ بہ ظاہر جناب امتیاز علی خاں عرشی کا ۱۱۶۲ھ کا قیاس قابل قبول نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں دار کے باپ کی واپسی کے انتظار میں ان کی شادی اپنے زمانے کے عام دستور کے خلاف بڑی عمر میں جا کر ہوئی۔

اظفری کے بیان کی روشنی میں جہاں دار ۱۱۶۶ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں تو اس لحاظ سے وہ ۱۱۷۰ھ میں چار پانچ برس کے، ۱۱۷۳ھ میں سات آٹھ کے اور ۱۱۸۵ھ میں انیس بیس برس کے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ انیس بیس برس کی عمر شادی کے لیے زیادہ موزوں دکھائی دیتی ہے اس لیے قرائن کی رو سے اظفری کی بیان کردہ عمر کا اندازہ صحیح نظر آتا ہے اور ہمارے دلائل سے ہم آہنگ۔ اظفری کا بیان یوں بھی معاصر ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے، دوسرے اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اظفری تیموری خانوادے ہی سے تھا۔

وہ خود جہاں دار شاہ سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اس کے خاندان کا شجرہ یہ ہے[1]۔

اورنگ زیب عالمگیر
|
شاہ عالم اول
|
جہاں دار شاہ

عزیزالدین عالم گیر ثانی	عفت آرا بیگم
شاہ عالم ثانی	سلطان محمد عیسیٰ
جہاں دار شاہ	سلطان محمد ولی
	ظہیرالدین اظفری

۱۔ "اظفری گورگانی اور ان کا ریختہ کلام" (سید علی عباس) صفحہ ۱۵ "صبح وطن اعظم" (اعظم) کے تذکرے میں غلطی سے دلی سے ان کا سفر ۱۲۱۲ھ لکھا ہے (صفحہ ۳۵) لیکن وہ صحیح نہیں۔

اس طرح جہاں دار شاہ پسر شاہ عالم ثانی سے اظفری کا خاندانی سلسلہ جہاں دار شاہ پسر شاہ عالم اول پر جا کر مل جاتا ہے - اظفری کے والد ان تیموری شہزادوں میں سے تھے جنھوں نے نظر بندی میں زندگی کاٹی - اظفری بھی پیدائش (۱۱۷۲ھ) سے ۱۲۰۲ھ تک قلعے کے اندر نظر بند رہے[1] تاہم ان کی وہ اطلاعات بھی جو اس کی پیدائش سے قبل کے واقعات سے متعلق ہیں ، یقیناً معتبر خاندانی روایات پر مبنی ہوں گی - اس لیے اظفری کا تخمینہ عمر قابل تسلیم ہے اور جہاں دار کی پیدائش ۱۱۶۶ھ کے لگ بھگ قرار دینی چاہیے - شاہ عالم نے ایک دوہے میں جہاں دار کی سال گرہ کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے :

آج بھئی اے بھلی برس گانٹھ جہاندار شاہ پیارے کی
ساتھ سکھی مل بن بن آؤ ، دیھو مبارک باد اللہ نستارے کی[2]

(۳)

جہاں دار کی ابتدائی تعلیم محصور "سلاطین"[3] کے طور پر ہوئی تھی جس میں عربی فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم شامل ہوگی - اس کے علمی اوصاف و کمالات فن کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیانات یہ ہیں :

جوانے بود مجمع قابلیت و اہلیت ، منبع سخاوت و شجاعت ، مخزن مروت ، معدن فتوت ، جامع جمیع اوصاف سلطانی ، قدردان کمالات انسانی ، خصوصاً دریائے حلم و شجاعت ، کوہے بود مستحکم ، چنانچہ بعضے اعزاء کہ از مصاحبان آں والا جاہ بودند ، نقل می کردند کہ از قلعۂ شاہ جہان آباد بہ سبب خفگی از پدر بزرگوار کمند انداختہ بیرون آمدہ ، و بہ کوچ متواتر در لکھنؤ رسید ، روزے با جمعیت بسیار برائے شکار رفتہ

---

۱ - ایضاً صفحہ ۱۶ ، ۲۶ -
۲ - "نادرات شاہی" صفحہ ۹۲ -
۳ - اصطلاح میں سلاطین آس شہزادے کو کہتے تھے جو قلعۂ معلیٰ میں نظر بند ہوتا تھا (اس کی جمع "سلاطینوں" ہے) -

بود کہ ناگاہ در صحرا فیل صحرائی بر آن شہزادۂ جوان بخت حملہ کردہ خواست کہ در خرطوم گرفتہ از جا برد کہ ناگاہ آن رستم دستان حملہٌ دلاورانہ نمودہ شمشیرے بر مستک فیل زد ، و از زخم تفنگ آن را ہلاک ساخت کہ باعث تعجب وزیر وغیرہ [و دیگر ؟] نظارگیان شد۔ بسیار عالی حوصلہ و اولوالعزم بود . جدت ذہن و جودت طبع و فہم رسا و فکر بجا داشت و اشعار فارسی و ہندی ہر دو را موزون است[1] ۔

مرشد زادۂ آفاق جہان دار شاہ کہ جہان دار تخلص می فرمایند ، در جمیع فنون یگانہٌ روزگار و وحید زمانہ است ۔ بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی و فارسی چنانچہ باید می کند[2] ۔

جہان دار تخلص شاہ زادۂ ولی عہد خورشید رکاب صاحب عالم خطاب کہ از بس علو ہمت و سمو منزلت مرتبہٌ عالی جای خود را باوج افلاک رسانیدہ و دست و دربارش ہنگامہٌ ابر نیسان را سرد ساختہ و وصف اسغنائے مزاج کہ خاصہ بادشاہان است خود را بہ کسب علم و ہنر مصروف داشتہ و کمالات بسیار در ذات با برکاتش جمع آمدہ ، مع ہذا بمقتضائے موزونیٌ طبع گاہ گاہے شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید[3] ۔

جہان دار تخلص ، نام گرامی جہان دار شاہ ، زینت دولت مسند جہان بانی خلف شاہ عالم بادشاہ جنت آرام گاہ ابن عالمگیر ثانی[4] ۔

جہاں‌دار تخلص ، بادشاہ زادۂ ولی عہد مرزا جوان بخت مرحوم ، فخر دودمان ابہت و حشمت ، کارکشائے امور سلطنت ، کیوان مکان ، مشتری منزلت ، مرشد زادۂ بلند ہمت ، تاج بہ تارک

---

۱ - "طبقات‌الشعرا" ترجمہ ، ۱۵۶ ۔
۲ - "عقد ثریا" (مصحفی) صفحہ ۲۰ ۔
۳ - "تذکرۂ ہندی" (مصحفی) صفحہ ۶۱ ۔
۴ - "دیوان جہان" (بینی نرائن جہان) صفحہ ۶۱ ۔

شوکت ، صاحب عالم و عالمیان ، سخن‌ور نکتہ پرور کہ شرح حشمش برون از تحریر منشیان عطارد رقم است ، باوجود وفور شان جہان داری ، بہ کمال علم و ہنر آراستہ بود و اکثر اوقات شعر ریختہ موزون می فرمود ۔ تعریف اشعار گہر نثارش خارج از بیان ۔ صد افسوس کہ آن درۃالتاج تیموریہ در عین شباب این جہان فانی را وداع نمودہ ، ساکن اعلی علیین گردید[1]۔

جہاں دار تخلص ، میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ نام ، خورشید آسمان بلند اختری اور سرفرازی کا ، ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا ، رونق دینے والا بارگاہ جہاں داری و جہاں بانی کو ، زینت بخشنے والا مسند ملک گیری اور کشور ستانی کو ، ہر خط جبین جہاں افروز کا اس کے واسطے روشن کرنے عالم کے ، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے ، دور کرنے والا تاریکئی فلاکت کا تھا اور دست دریا نوال اس کا افراط جود و کرم سے مانند ید بیضا کے ، روشن کرنے والا خوش ناموسئی امارت و ایالت کا ، بخشش نے اس کی دشمنی آسمان کے دل سے فلک زدوں کے نکالی اور ہمت نے اس کی گرہ بدطالعی کی پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی[2] ۔

جہان دار تخلص مرزا جہان دار شاہ عرف مرزا جوان بخت بہادر فی عہد شاہ عالم بادشاہ[3] ۔

مرشد زادۂ عالی تبار ، مرزا جوان بخت المتخلص بلقب جہاں‌دار ، ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی ، جوانے خجستہ منظر ، فلک افسر ، عیاش مزاج بود ۔ در شہر محمد آباد عرف بنارس بہ کمال عیش و عشرت اوقات ہمایون صرف می نمود ۔ گاہ گاہ مطلعے و غزلے بہ حسب اتفاق از طبع وقادش جلوہ افروز می گردید ۔

---

۱ ۔ ''عمدۂ منتخبہ'' (سرور) صفحہ ۱۲۷ ، ۱۲۸ ۔
۲ ۔ ''گلشن ہند'' (لطف) صفحہ ۸۸ ، ۸۹ ۔
۳ ۔ ''سخن شعرا'' (نساخ) صفحہ ۱۱۸ ۔

ناگاہ در عین آغاز جوانی سریر جنت را زیب و زینت بخشید[1] -

جہان دار - مرزا (شاہزادہ) جوان بخت جہان دار شاہ، ولد شہنشاہ شاہ عالم[2] -

جہان دار - تخلص مہین پور خلاف شاہزادہ ولی عہد مرزا جہان دار شاہ مرحوم المعروف مرزا جوان بخت است - از آنجا کہ تعریف اخلاق حمیدۂ آن بر گزیدۂ انفس و آفاق و توصیف اوصاف پسندیدۂ آن منظور نظر خلاق علی الاطلاق بحیطۂ تقریر و احاطۂ تحریر نمی گنجد، عنان کمیت قلم حقائق رقم را ازان جولانگاہ منعطف ساختہ بمیدان تحریر نبذے از اشعار آب دار کہ از طبع وقاد آن خلاصۂ دودمان گورگانی و زبدۂ خاندان صاحب قرانی سر زدہ جولان می دہم - از شیرین گفتاری ہائے جناب ایشان این نہ شعر کہ بہ من رسیدہ بسلک ترقیم کشیدہ[3] -

مرزا جہان دار شاہ عرف مرزا جوان بخت بہادر ولی عہد حضرت شاہ عالم بادشاہ مرشد زادۂ فہم و فراست اور عقل و دانائی میں یکتائے روزگار تھے[4] -

جہان دار، میرزا جوان بخت قرۃالعین عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ دہلی مستجمع محامد و مناقب بسیار بود[5] -

۱ - ''تذکرۂ عشقی'' (عشقی عظیم آبادی) در ''دو تذکرے'' مرتبہ کلیم الدین احمد صفحہ ۱۲۹ -
۲ - ''یادگار شعرا'' (اردو ترجمہ اسپرنگر اودھ کٹالاگ ؛ طفیل احمد) صفحہ ٦٦ -
۳ - ''مجموعۂ نغز'' صفحہ ۱۲٦ -
۴ - ''گلشن بے خار'' (شیفتہ، اردو ترجمہ از احسان الحق فاروق) صفحہ ۱٦۲ -
۵ - ''روز روشن'' (نواب صدیق حسن) صفحہ ۱۵۸ -

فرینکلن نے جہاں دار شاہ کے کردار کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

> Mirza Jawaun Bukht Jehaundar Shah, though from capacity not fitted for the busy scenes of active life, nor possessing any talents for government, was nevertheless irreproachable in his private character, and deemed by all an accomplished gentleman. To his friends he was constant and to his dependants humane and benevolent. His domestic qualities and filial piety have been already exhibited to the world by testimony the most respectable : and in his disposition he possessed, in an eminent degree, that characteristic amiability, which successive historians have unanimously attributed to the princes of the house of Timoor.[1]

> (جہاں‌دار) کو موسیقی سے دل چسپی تھی ، اس کے علاوہ ریاضی کا ماہر تھا[۲] ۔

> شاہزادہ جہاں دار شاہ بہت بذلہ منج ، ظریف اور شوخ طبع تھا ۔ اس کے اردو اشعار میں بڑی شوخی تھی ، موسیقی سے بھی ذوق رکھتا تھا ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں جہاں دار تخلص کرتا تھا[۳] ۔

ان بیانات سے جہاں‌دار کی شخصیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت کا حال نہیں کھلتا ۔ آخری دونوں اقتباس ''واقعات اظفری'' سے ماخوذ ہیں ۔ واقعات میں جہاں دار کے بارے میں لکھا ہے :

> ''این بادشاہ زادہ بسیار حریف و ظریف و شوخ طبع و رنگین

1. The History of the reign of Shah Aulum (Franklin) p. 162.

۲ ۔ ''اظفری گورگانی اور ان کا ریختہ کلام'' (سید علی عباس) صفحہ ۳۵ ۔

۳ ۔ ''بزم تیموریہ'' (صباح الدین عبدالرحمان) صفحہ ۲۲۹ ۔

مزاج بود و ریختہ شوخ گفتے و در فن موسیقی نیز ذائقہ داشت
و در ریختہ و غزل فارسی جہان دار تخلص می نمودند'۱

جہاں دار کی تعلیم میں اردو فارسی شاعری ، موسیقی اور ریاضی کا خصوصی ذکر ہوا ہے ۔ موسیقی سے قطع نظر فارسی اردو کی تعلیم مولوی نظام‌الدین دہلوی سے حاصل کی[۲] ۔ مولوی نظام‌الدین اس زمانے کے علما میں شمار ہوتے تھے لیکن اپنے زمانے کی کوئی جید ہستی معلوم نہیں ہوتے ، کیونکہ علما کے تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں ۔ تاہم یہ کیا کم اہم بات ہے کہ وہ خانوادۂ شیخ عبدالحق محدث کے فرد تھے ۔ ''حیات عبدالحق محدث دہلوی'' میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے پورا شجرۂ نسب دیا ہے[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کا شجرۂ نسب معاصر موصوف کی کتاب سے لے کر اگلے صفحے پر درج کیا جاتا ہے تاکہ مولوی نظام‌الدین دہلوی کے حسب نسب کے بارے میں معلوم ہو سکے ۔

نظام‌الدین بن محب اللہ بن نور الحق ثانی بن محب اللہ بن شیخ نوراللہ بن شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کسی تالیف یا تصنیف کا ہمیں علم نہیں لیکن ان کے براہ راست سلسلے میں کئی بزرگ صاحب تصنیف ہوئے ہیں ۔ شاہ عبدالحق محدث کے فرزند شیخ نورالحق مشرقی کی بارہ کتابیں ہیں[۴] ۔ ان کے فرزند شیخ محب اللہ (اول) ''منبع العلم'' (ترجمۂ ''صحیح مسلم'') کے مصنف ہیں ۔ ان کے فرزند نورالحق ثانی ''شرح ماثبت بالسنۃ'' کے مصنف ہیں ۔ ان کی یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عربی تصنیف ''ماثبت بالسنۃ'' کی فارسی شرح ہے[۵] نظام‌الدین انہی نورالحق ثانی کے پوتے تھے ۔ یہ اول جہاں دار کے اتالیق ، استاد اور بعدہ کارخانوں کے منتظم رہے ۔ جب جہاں دار دہلی سے اودھ اور پھر

۱ ۔ واقعات اظفری (اظفری) ؛ قلمی ، پنجاب پبلک لائبریری ، ورق ۵۱ الف ۔
۲ ۔ ''نادرات شاہی'' ، دیباچہ صفحہ ۵۰ ۔
۳ ۔ ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' (خلیق احمد نظامی) صفحہ ۲۵۵۔
۴ ۔ ایضاً صفحہ ۲۶۵ ۔
۵ ۔ ایضاً صفحہ ۲۶۱ ۔

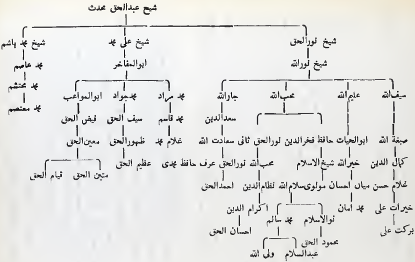

شیخ عبدالحق محدث
شیخ نورالحق
شیخ علی محمد
شیخ محمد ہاشم
شیخ نوراللہ
ابوالمفاخر
محمد عاصم
محمد محتشم
محمد معتصم
سیف‌اللہ
علیم‌اللہ
محب‌اللہ
جاراللہ
محمد مراد
محمدجواد
ابوالمواعب
صبغۃ اللہ
ابوالحیات
حافظ فخرالدین
نورالحق ثانی
سعادت اللہ
سعدالدین
محمد قاسم
سیف الحق
فیض الحق
غلام محمد
ظہورالحق
معین‌الحق
کمال الدین
خیراللہ
شیخ‌الاسلام
محب‌اللہ
نورالحق عرف حافظ مہدی
عظیم الحق
متین الحق
قیام الحق
غلام حسن
میاں احسان
مولوی‌سلام‌اللہ
نظام‌الدین
احمدالحق
خیرات علی
محمد امان
نوالاسلام
محمد سالم
اکرام الدین
برکت علی
محمود الحق
احسان الحق
عبدالسلام
ولی اللہ

بنارس گئے تو یہ بھی ہمراہ تھے - وہاں یہ میر منشی کی خدمت اور مستعد خاں کے خطاب سے بھی نوازے گئے - جن دنوں شہزادہ دہلی آیا یہ پلول کے حاکم ہوئے تھے - وہاں سے دلی میں رہے - پھر جہاں دار کے انتقال پر بنارس جا کر قتلق سلطان بیگم کی سرکار میں نوکر ہوئے اور وہیں ۶ - جادی الاول ۱۲۳۲ھ/۲۴ - مارچ ۱۸۱۷ء کو انتقال کیا[1] جہاں دار نے غالباً فارسی اردو کی تعلیم ان سے پائی تھی -

(۴)

عزیزالدین عالم گیر ثانی کی تخت نشینی ۱۰ - شعبان ۱۱۶۷ھ (۲ - جون ۱۷۵۴ء) کو عمادالملک کے ہاتھوں ہوئی اور وہ قید اور نظر بندی کی صعوبت سے آزاد ہو کر تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے شہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم) ولی عہد قرار پایا اور اس طرح جہاں دار بھی محل کی کھلی فضا میں پرورش پانے لگا لیکن حقیقت میں سیاہ و سفید کا مالک عمادالملک تھا - ان کی اذیت سے تنگ آ کر ولی عہد عالی گوہر نے رہائی کی ٹھانی اور رمضان ۱۱۷۰ھ میں عماد سے جان بچا کر اس کے مد مقابل نجیب‌الدولہ کے پاس آیا - اس کے مشورے سے بنگال کی فتح کی تدبیر سوجھی اور اسی مقصد سے لکھنؤ کا رخ کیا ، تاکہ شجاع‌الدولہ کی امداد و اعانت سے منصوبہ تکمیل کو پہنچے - اس کی آمد سے مشرقی علاقوں میں سیاسی سرگرمی اپنے شباب پر آ گئی - اس زمانے میں جب کہ عالی گوہر کھٹولی کے مقام پر فروکش تھا ، اسے اپنے والد کے قتل کی اطلاع ملی - عالم‌گیر ثانی ۸ - ربیع‌الآخر ۱۱۷۳ھ/۲۹ - نومبر ۱۷۵۹ء کو قتل ہوا - اس کی اطلاع یکم جادی‌الاول ۱۱۷۳ھ کو وصول ہوئی اور ۴ - جادی‌الاول ۱۱۷۳ھ کو عالی گوہر شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ہو گیا -

اس وقت دلی کا یہ عالم تھا کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد آمد تھی

---

۱ - ''نادرات شاہی'' ، دیباچہ صفحہ ۵۰ ، ۵۱ ، فٹ نوٹ بہ حوالہ ''نشتر عشق'' -

جیسے نجیب‌الدولہ نے آمادۂ سفر کیا تھا ۔ عمادالملک نے عالم‌گیر ثانی کے قتل کے بعد محی‌الملت کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور وہ شاہ جہاں ثانی کے لقب سے پکارا گیا ۔ ان حالات میں ابدالی ہندوستان میں وارد ہوا ۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کی جیت ہو گئی ۔ ۱۶ ۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو یہ معرکہ سر ہوا اور ابدالی نے دلی کا رخ کیا ۔ "نریلہ کے مقام پر سابق ملکہ زینت محل اور اس کے پوتے مرزا جواں بخت نے فاتح کا استقبال کیا ۔ ۲۹ ۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی نے شاہ عالم کی بادشاہت کی توثیق کر کے اس کی غیر حاضری میں جہاں‌دار کو نائب بنا دیا ۔ انتظام پورا کر کے ابدالی نے آخر ۲۵ ۔ مارچ ۱۷۶۱ء کو دلی سے کوچ کیا"[1] ۔

ابدالی نے وزارت کا منصب بدستور عمادالملک کے لیے مخصوص کیا اور نجیب‌الدولہ کو میر بخشی بنایا ۔ عمادالملک اس وقت متھرا میں پڑا تھا ۔ اس نے آنے میں دیر کر دی ۔ اس دوران میں نجیب‌الدولہ نے جہاں‌دار اور زینت محل کا زیادہ قرب حاصل کر لیا اور اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کر لی ۔ اگلے برس جب ابدالی دوبارہ ہندوستان میں وارد ہوا تو عمادالملک کی بجائے شجاع‌الدولہ وزیر قرار دیا گیا[2] اور اس طرح عمادالملک کا اب دلی کی حکومت میں براہ راست کوئی دخل نہ رہا اور نجیب‌الدولہ کا دور دورہ ہوا ۔

اس زمانے میں مرہٹے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ چند سال دلی میں امن و امان رہا اور دارالحکومت کی حالت بہتر ہو گئی ۔ بعض مورخ دلی کے حسن انتظام کا ذمہ دار نجیب‌الدولہ کو قرار دیتے ہیں ، بعض کے نزدیک یہ سب کچھ جہاں‌دار کی فراست اور حسن تدبیر کے سبب ممکن ہوا ۔ ابتدا میں امور ملکی یا تو نجیب‌الدولہ کے توسط سے یا پھر بابا مرزا کے مشورے سے انجام پاتے ہوں گے لیکن آہستہ آہستہ جہاں‌دار نظم و نسق کا تجربہ

1. Ahmad Shah Durrani (Ganda Singh) pp. 260-261, 264.
2. Najibud Daulah, his Life and Times (Sh. Abdur Rashid) pp. LXXXII, LXXXIII.

حاصل کر گیا اور اس کا یہ دس برس کا عہد حکومت اسے اہل دربار میں مقبول بنا گیا :

> "It appears that the young prince suddenly called upon to fill such an important office and in such exceptional times gave a good account of himself, maintaining harmonious relations with the minister and making himself popular with the nobles of the court. For a period of ten years he acted in this capacity and won the confidence and esteem of all[1]".

پورب میں سیاسی حالات زیادہ تیزی سے بدل رہے تھے - ۲۶ ربیع‌الثانی ۱۱۷۸ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر انگریزوں نے شاہ عالم اور اس کے ساتھیوں کے لشکر کو شکست دے دی تھی - نتیجے کے طور پر بادشاہ نے ۱۲ - اگست ۱۷۶۵ء کو بنگال ، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کو دے دی - ۱۹ - اگست ۱۷۶۵ء کے معاہدے سے شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیدی ہو کر رہ گیا - الہ آباد اور کوڑا اس کی جاگیر قرار پائے اور وہ الہ آباد میں فروکش ہو گیا - ادھر دلی کے باہر کے علاقے میں امن و امان کی بحالی اور جاٹوں اور سکھوں کی روک تھام نجیب الدولہ کرتا رہا - لیکن سات برس سے وہ مسلسل تپ میں مبتلا تھا ، صحت نے جواب دیا[2] مگر ۱۱۸۳ھ میں اس نے دلی کو جہاں دار شاہ ، زینت محل اور ضابطہ خاں (اپنے بیٹے) کے سپرد کیا - ۱۵ - اکتوبر ۱۷۶۹ء کو شاہدرہ میں ٹھہرا خود محل میں جا کر الوداع کہی اور اپنے وطن نجیب آباد کی طرف روانہ ہوا[3] - اب مرہٹے دس برس کے بعد پھر آ دھمکے ، نجیب کو دست تعاون

1. Indian Historical Records Commission Proceedings Vol. XIV Dec. 1937 p. 138.
2. Proceedings of All India History Congress, Allahabad Session 1838 pp 552—502 also Shujaud-Daulah (Sirivastava, Vol. II p. 231.
3. Najibud-Daulah—his Life and times (Sh. Abur Rashid) p. 125. The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II pp. 295—298.

بڑھانا پڑا - ہلکر کی معرفت تحریری اقرار نامہ ہوا اور مرہٹوں کا رخ دلی سے پھر گیا - یہ بلا ٹلی ہی تھی کہ ہاپڑ کے مقام پر نجیب الدولہ کا انتقال ہو گیا - بہ قول سرکار نجیب ۳۱ - اکتوبر ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا[1] معاصر مورخ نورالدین نے "سرگزشت نجیب الدولہ" میں اس کی وفات کا سنہ ۱۱۸۶ھ دیا ہے جو درست نہیں[2] - حقیقت یہ ہے کہ نجیب ۱۰ - رجب ۱۱۸۴ھ/ ۳۰ - اکتوبر ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا تھا -

(۵)

شاہ عالم نے الہ آباد میں سات برس عیش و عشرت اور شعر و شاعری میں بسر کر کے شمالی ہند کی طرف کوچ کا ارادہ کر لیا - الہ آباد میں انگریز قلعہ دار (سکاٹ) کی مسلسل بدسلوکیوں نے پہلے ہی دل برداشتہ کر دیا تھا ، ادھر دلی کی حالت فراق کی زبانی سنیے :

> در سنہ ہزار و یک صد و ہشتاد و چہار ہجری رام چندر گنیش و بیساجی و تکوجی ہلکر و مادھو راؤ سیندھیہ ، سرداران جنوب با فوج سنگین از دکن آمدہ جنگ نول سنگھ جاٹ زدہ بہ دارالخلافہ رسیدہ شرف آستان بوس مرشد زادۂ ولی عہد ، صاحب عالم مرزا جوان بخت جہان دار شاہ بہادر حاصل کردند - چون در ایام امیرالامرا نجیب الدولہ وفات یافتہ بود ، در تمامئ ہندوستان کسی سد آنہا نمی توانست شد ، عبور دریای گنگ کردہ قریب بہ فرخ آباد رسیدند و بادشاہ را طلبیدند - حضرت بدولت باوجودیکہ وزیرالممالک شجاع الدولہ و سرداران فرنگ

---

1. The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II pp. 301—304.
2. Najibud-Daula—his life and times (Sh. Abdur Rashid) p. 136. See also Appendex p. 173 and Preface p. XVI جہاں تصحیح کی گئی ہے - یاد رہے کہ Twilight of the Mughals (1951) پرسی ول سپئیر (صفحہ ۱۷) نے نجیب کا انتقال نجیب آباد میں بیان کیا ہے جو صحیح نہیں -

راضی نبودند ، از اله آباد کوچ فرموده گرم و گیرا خود را به فرخ آباد رساندند و با سران دکن ملحق گشتند اقبال سلطانی کار کرد که هم دران ایام احمد خان بنگش ازین جهان فانی بگذشت - از پسرش که مخاطب به مظفر جنگ است چیزی بطریق ضبطی گرفته ، از فرخ آباد بعد تاخت و تاراج سکرتال و پتهر گڈھ که مقر و مامن ضابطه خان پسر نجیب الدوله بود معه سرداران جنوبی کوچا کوچ بنواح دارالخلافه رسید - بیست و نهم رمضان‌المبارک سنه الف و مایه و ثمانین و خمس سایه بلند پایه بر سکان دارالخلافه افگندند و به شاهزادهٔ ولی عهد و دیگر شاهزاده‌ها و سایر بیگمات که به تعب هجران شهنشاه زمان گرفتار بودند جمال جهان آرا نموده لذت حیات بخشیدند و به دارالخلافه و جمیع مردم از سر نو به برکت تشریف شریف شرف حاصل شد - چنانچه نرسنگ داس خوش دل گفته :

بر سر اہل شاہ جہان آباد   ظل گسترد ظل سبحانی
روز تشریف بست و نه رمضان   سال تاریخ عید رمضانی[1]

شاہ عالم نے مرہٹوں کی فرمائش پر الہ آباد سے ۱۳ اپریل ۱۷۷۱ء کو کوچ کیا تھا[2] اور جیسا کہ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے یہ قافلہ ۲۹ - رمضان ۱۱۸۵ھ/۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو دہلی میں داخل ہوا - مرہٹے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے تمنائی تھے اس لیے انھوں نے راہ ہموار کرنی شروع کی - ان کی راہ میں سب سے بڑا کانٹا ضابطہ خان پسر نجیب الدولہ تھا - اسے شاہ عالم نے شکست دے کر مشکل آسان کر دی لیکن اس زمانے میں خود مرہٹوں کو بھی اپنے علاقے کے حالات کے

---

۱ - "وقائع عالم شاہی" صفحہ ۶ ، ۷ - نیز دیکھیے The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) جلد ۳ ، صفحہ ۲۲ -

۲ - "میر حسن اور ان کا زمانہ" (وحید قریشی) صفحہ ۸۳ بحوالہ The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II, pp. 407—408.

سبب واپس دکن کی طرف لوٹنا پڑا - اب شاہ عالم کو شمالی ہند میں حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا -

جہاں دار شاہ باپ کی آمد پر سیاست سے الگ ہوگیا - اسے اپنے ذاتی اخراجات کے لیے جاگیر مل گئی اور اطمینان کی زندگی گزارنے لگا - اس زمانے میں شاہ عالم نے جہاں دار کی شادی مرزا بابا کی لڑکی جینا بیگم سے کر دی[1] - اب شاہ عالم کے سیاہ و سفید کا مالک اس کا الہ آباد کے زمانے کا معتمد نجف خاں ہوگیا - ذوالفقارالدولہ نواب نجف خاں بہادر غالب جنگ امیرالامرا اور نائب وزیر امور ملکی انجام دینے لگا اور شاہ عالم عیش و نشاط اور شعر و سخن میں مصروف ہوگیا - ۱۱۹۶ھ تک نجف خاں دلی کی قسمت کا تابندہ ستارہ تھا - اس زمانے میں امن و امان بحال اور رعایا خوش حال ہو گئی لیکن ۲۲ ربیع‌الآخر ۱۱۹۶ھ/۶ اپریل ۱۷۸۲ء کو نجف خاں نے انتقال کیا[2] اور امرائے دربار کی سازشوں کے دروازے کھل گئے - نجف خاں کا پروردہ افراسیاب خاں بادشاہ کا معتمد بنا لیکن جلد ہی مرزا محمد شفیع نے رسوخ حاصل کرکے وزارت کا منصب پا لیا - مرزا شفیع کے ظلم و ستم سے رعایا اور درباری سبھی نالاں تھے - ایسے میں جہاں‌دار نے باپ کی مدد کی اور دربار کے برگشتہ خاطر امرا سے مل کر مرزا محمد شفیع کو بے دخل کرنے کی ٹھانی - مرزا محمد شفیع کو پتا چل گیا اور اس نے راہ فرار اختیار کی - اب جہاں‌دار شاہ نے عروج پایا اور امور ملکی کی درستی کی طرف متوجہ ہوا لیکن ادھر مرزا محمد شفیع اور افراسیاب خاں نے باہمی صلح کر کے جہاں‌دار کے خلاف محاذ بنا لیا -

---

۱ - ''نادرات شاہی'' - دیباچہ صفحہ ۵۲ -
۲ - ''نادرات شاہی'' (شاہ عالم) دیباچہ (عرشی) صفحہ ۴۳ - ''وقائع عالم شاہی فراق'' صفحہ ۱۰ :

در مہ ربیع آخر اثنای عشرہ ثالث
تیر دعاے اعدا ناگہ بر ہدف رفت
از جسم پاک روحش چون رفت فکر کر دم
سالش بگفت ہاتف ''میر نجف نجف رفت''
۱۱۹۶ھ

شاہ عالم نے طبعی کمزوری دکھائی۔ شہزادے کے ساتھیوں کو زیر کیا گیا اور ایک بار پھر مرزا محمد شفیع اپنے عہدے پر بحال ہوگیا۔ افراسیاب اور مرزا محمد شفیع نے اس اشتراک عمل اور شاہ عالم کی پست ہمتی سے امرائے دہلی کی زندگیاں تلخ کر دیں۔ جہاں‌دار اور اس کے طرف‌داروں کو پریشان و ذلیل کیا گیا اور شہزادے کو دوبارہ بے تعلقی کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ اس دوران میں افراسیاب خاں نے مرزا محمد شفیع کو قتل کرا دیا۔ فراق کے قول کے مطابق یہ کام محمد بیگ خاں نے انجام دیا۔ محمد شفیع خاں' (ناصر الدولہ) کے قتل کی تاریخ سہ شنبہ ۲۵۔ شوال ۱۱۹۷ھ/۲۳ ستمبر ۱۷۸۳ء ہے[1]۔ اب افراسیاب خاں (اشرف الدولہ) امیرالامرا مقرر ہوا اور شاہ عالم کے مزاج پر حاوی ہو کر کاروبار سلطنت پر چھا گیا۔

(۶)

محمد شفیع کے قتل کے بعد شاہی خاندان کے لیے حالات ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور افراسیاب خاں اس حد تک خود سر ہوگیا تھا کہ اس کے ہاتھوں خاندان کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی ایک جھلک ۲۳۔مارچ ۱۷۸۴ء کے بعد کے ایک واقعے سے بہ خوبی ہوسکتی ہے۔ سرکار لکھتے ہیں:

> The Coronation anniversary over (23rd March 1784), Afrasiyab urged the Emperor to go with him to Agra and help in collecting the tribute. But the necessary transport could not be got ready for want of money and the depletion of the Imperial stores since Najaf's death. Afrasiyab ascribed this

۱۔ "وقائع عالم شاہی" صفحہ ۱۸ لیکن بعض مورخ محمد بیگ خاں کی بجائے اس کے بھتیجے اسماعیل بیگ خاں کے قاتل ہونے کے داعی ہیں۔ "حواشی وقائع عالم شاہی" (عرشی) صفحہ ۱۹۹۔ عیسوی سنہ Fall of the Mughal Empire (Sarkar) جلد سوم ۱۸۳— ۱۸۵ سے ماخوذ ہے۔

delay to Abdul Ahand's obstruction, and he created a scene at Court, abusing the Emperor and the princes and stinting them in their allowances. Weary of his gilded chains, the heir to the throne, Prince Jahandar Shah (Jawan Bakht) slipped out of the Delhi palace in the midst of a violent dust storm on a dark night (14th April) and reached Lucknow (6th May), where he was welcomed by the Wazir and Warren Hastings.[1]

شہزادے نے دلی سے بڑے ڈرامائی انداز میں فرار اختیار کیا۔ تیموری خاندان کے شہزادوں میں وہی ایک ایسا ذہین دماغ تھا جو شیطانی کھیل کھیلنے والے امرا کو روکنے اور ان کی بنائی ہوئی چالوں کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شاہ عالم ظالم اور جفا پیشہ افراسیاب کے ہاتھوں نالاں تھا، اس سے رہائی پانے کی ایک ہی تدبیر ہوسکتی تھی کہ انگریزوں سے استمداد کی جائے۔ انگریزی مدد کا منصوبہ مرزا نجف خاں کے انتقال کے بعد سے فضا میں تھا۔ جب دلی کے حالات نجف خاں کی وفات پر بگڑے تو شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے مدد کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ ۲۰۔ اگست ۱۷۸۴ء کو وارن ہیسٹنگز (گورنر جنرل) نے میجر جیمز براؤن کو ایجنٹ مقرر کر کے دلی کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ براؤن کے دلی پہنچنے تک مرزا محمد شفیع نے اپنے مخالفین کو کچل کر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے مرزا محمد شفیع کی سعی یہ تھی کہ براؤن راستے ہی سے واپس چلا جائے، لیکن براؤن جلد ہی آیا اور حیلے بہانے سے اپنے قدم جمانے لگا۔ اسی زمانے میں افراسیاب نے محمد شفیع کو ختم کر دیا اور خود امیرالامرا ہوگیا۔ چنانچہ براؤن نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۵۔ فروری ۱۷۸۴ء کو بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل کر لی۔ اس مشن کا اصل مقصد براؤن کے نزدیک یہ تھا کہ کسی تدبیر سے مرہٹوں کے خلاف امرا میں ایک پارٹی بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ براؤن اس کام میں مشغول

1. Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. 3 pp. 190 – 191.

تھا ، جب جہان دار دلی سے بھاگ نکلا۱ - اس طرح تدبیر کا راستہ کھلا تھا - شہزادہ اپنے باپ کی خواہشات اور توقعات کا اندازہ کر رہا تھا - جب یہ خبر ملی کہ وارن ہیسٹنگز لکھنؤ میں آیا ہوا ہے تو شہزادے کو اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا موقع قریب نظر آیا - وہ جان پر کھیل کر دلی سے نکل کھڑا ہوا[2] - دلی سے جہاں دار کا فرار بڑا دلچسپ تھا - اس لذیذ حکایت کو شہزادے نے وارن ہیسٹنگز کی فرمائش پر خود تفصیل سے بیان کیا تھا - روداد کا کوئی نسخہ اب موجود نہیں لیکن جونے تھن سکاٹ (Jonathan Scott) کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ موجود ہے ، جو Warren Hastings از "Memoirs relative to the State of India" طبع لندن ۱۷۸۶ء صفحات ۱۶۳ و ۱۹۶ پر درج ہے[3] - سر جادو ناتھ سرکار

1. Historical Records Commission Proceedings of Meetings. Vol XIV Dec. 1937; (The mission of James Browne to the Delhi Court, 1783—1785 (Sir Jadu Nath Sarkar) pp. 12—19.
2. Ibid. Prnice Jawan Bakht Jahandar Shah (Abdul Ali) p. 139.
3. Persian Literature—A bio-bibliographical Survey (C.A. Storey) Vol. I Section II Fasciculus III ed. 1939. pp. 624, 625.

"قاموس المشاہیر" (نظامی بدایونی) میں ہے :

گارسن ڈی تاسی کے سفر نامے (کذا) سے پتا چلتا ہے کہ ولایت میں اس کی تصنیف سے ایک کتاب موسومہ بیاض عنایت مرشد زادہ موجود ہے جس کا انگریزی ترجمہ اسکاٹ نے کیا تھا اور جو مسٹر ہیسٹنگز کے ریویو آف دی اسٹیٹ آف بنگال کے تتمے کے طور پر شائع ہوا تھا - (جلد اول صفحہ ۱۰۳) -

"طبقات شعرائے ہند" (کریم الدین) جو گارسین دتاسی کی تاریخ ادب کی تلخیص و اضافہ ہے اس میں صرف اس قدر ہے کہ ایک جلد قلمی بنام بیاض عنایت مرشد زادہ کمپنی کے کتاب خانے کی جو اس نے گورنر جنرل ہیسٹنگز کو نذر کی تھی موجود ہے (طبقات صفحہ ۸۴ ، ۸۵) -

انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات میں "دیوان جہاں دار" کے اس نسخے کی تفصیل درج ہے - نظامی بدایونی کی غلط فہمی ظاہر ہے -

نے اس ترجمے سے تفصیلات اخذ کر کے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں ۔ فراق کی روداد یہ ہے :

''در ایام حکومت اشرف الدولہ (افراسیاب خان) و مجد الدولہ (عبدالاحد خان کشمیری) کاری کہ بنیانِ خلافت را حرکت داد بظہور آمد ۔ و این ہا از اتفاقات آن است کہ شاہزادۂ ولی عہد (جہان دار شاہ) را باستصواب رای جہان نما کہ با ناصر الدولہ (محمد شفیع خان) موافق بود و بعدِ کشتہ شدن او مختار مہام سلطنت ، مزاج اقدس را از جناب مرشد زادہ منغض ساختہ در انتہاز بودند کہ شہزادہ را مسلسل کنند ۔ شہزادہ بدریافت این ماجرا در قصد خروج از دولت خانۂ بادشاہی شد ، و ہشت ماہ اخفای راز و مدارا با مخالفان کرد ۔ چون مکرم‌الدولہ علی اکبر خان بہادر برادر تاج محل بیگم والدۂ ولی عہد خلافت ، باتفاق عبدالرحمان خواص کہ عامل جا گیرات مرشد زادہ بود ، بعضی از سرداران گوجر را جہتہ ہمراہی شہزادہ فراہم آورد ۔ شہزادہ قتلق سلطان بیگم را کہ حلیلۂ جلیلہ و از یک سال محرم راز بود ، کشف ارادہ کردہ ، از حجرۂ خواب گاہ بشب ۲۳ بیست و سوم جمادی الاول سنہ ۲۶ بیست و ششم در حالی کہ طوفان باد و باران در طغیانی بود ، و از شدت ظلمت ابر ہیچ معاینہ نمی شد ، چہار گھڑی از شب مذکور رفتہ ، بجای زیر جامہ جانگیہ پوشیدہ و بر کمربند لنگ ابریشمی کہ مولوی فخرالدین مرشد آنحضرت دادہ بود ، پیچیدہ و بر بالای کلاہی رومال شال تحت الحنک بستہ و دوشالۂ سیاہ بر دوش گرفتہ ، قریب بہ پنج گھڑی شب بر بام خود برآمدہ ، بام بام تا بفیض نہر رسیدہ ، چون از رفقا کسی را نیافت ، عود بنام خانۂ خود فرمود و نزدیک بہ بام خانہ عبدالرحمان را یافتہ ، قریب بفیض نہر ثابت خان را دیدہ ، از منفذ دیواری کہ گدار یک کس داشت ، پائین آمدہ ، باستعانت نردبان ریسمان از قلعہ بزیر آمدہ ، بہر نوع خود را بہ میدان نیلہ بُرج افگندند و از آن جا بہ مشورۂ مکرم الدولہ

رو به مشرق نهادند و از معبر قمرالدین‌نگر عبور گنگا کرده روانه پیشتر شدند و در اثنای راه جاعت سنگھ گوجر مادیانی و در رامپور فیض الله خاں زمیندار رامپور دو ہزار روپیہ و دو زنجیر فیل و چند راس اسپ و چند منزل خیمہ با لوازمۂ بار برداری پیش کش کرد[۱]۔

جہاں دار شاہ ہنڈن ندی کو عبور کر کے سرورہ ، اورنگ آباد قمرالدین نگر گھاٹ سے گزر کر پھپڑاؤں ، امروہہ اور رامپور آئے وہاں سے بریلی ، شاہ آباد ، میاں گنج ، سوہان اور لکھنؤ میں جا کر دم لیا[۲]۔

شہزادے کے اس فرار سے افراسیاب بہت بے چین ہوا اور شاہ عالم کو مجبور کیا کہ جہاں دار کو واپس بلایا جائے۔ اس غرض کے لیے میجر براؤن کو لکھنؤ روانہ کیا گیا کہ ہیسٹنگز سے مل کر اس سے شہزادے کی واپسی اور دیوانی کے سلسلے کی اس رقم کا مطالبہ کیا جائے جو دلی آنے کے بعد بند تھی۔ براؤن لکھنؤ جا کر اسی طرح لوٹ آیا اور شاہ عالم کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح لگا رہا۔ جہاں دار شاہ ٦ - ۱۷۸۴ء کو لکھنؤ میں پہنچ گیا تھا اور وارن ہیسٹنگز اور آصف‌الدولہ نے اس کا خیر مقدم کیا تھا[۳]۔ جہاں دار شاہ نے گورنر جنرل سے امداد کی خواہش کی لیکن گورنر جنرل کی کونسل اس پر رضامند نہ ہوئی کہ دلی کے معاملات میں براہ راست دخل دیا جائے۔ اس پر ہیسٹنگز اس بات پر آ لگا کہ کسی نہ کسی طرح شہزادے کو واپس دہلی بھیجا جائے۔ جہاں دار شاہ چاہتا تھا کہ اس کے ہمراہ اتنی فوج کی جائے جو اس کی حفاظت کر سکے ، دوسرے اسے افراسیاب سے جاگیر دلائی جائے، تیسرے سکھوں کی روک تھام بھی انگریز کریں۔ ہیسٹنگز اس کے لیے آمادہ ہو گیا کہ دربار دہلی سے اس موضوع پر بات چیت کی جائے۔ افراسیاب خاں اس شرائط پر آمادہ تھا کہ شہزادہ چار انگریزی کمپنیوں کے ہمراہ بے شک واپس آ جائے۔ جاگیر کا وعدہ

۱ - "وقائع عالم شاہی" صفحہ ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ -
۲ - "تاریخ اودھ" (نجم الغنی) جلد سوم صفحہ ۲۵۹ تا ۲۶۳ -
۳ - اس خیر مقدم کی تفصیلات کے لیے دیکھیے "ذکر میر" یا اس کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" (نثار احمد فاروق) صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۴ -

بھی کر لیا ؛ بشرطیکہ شہزادہ افراسیاب کا معین و مددگار ہو کر اس کی مرضی پر چلے ۔ یہ طے ہوا تو جہاں دار شاہ دلی آنے کے لیے فرخ آباد پہنچا ۔ وائے قسمت کہ ہیسٹنگز کو کلکتے لوٹنا پڑا اور اسی زمانے میں افراسیاب خاں قتل ہو گیا ۔ افراسیاب کا اقتدار صرف تیرہ ماہ رہا تھا ۔ مرزا محمد شفیع خاں کے بھائی زین العابدین نے ۲ - نومبر ۱۷۸۳ء کو افراسیاب کو ٹھکانے لگا دیا[۱] ۔ حالات کے اس آلٹ پھیر نے جہاں دار شاہ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ۔ شاہ عالم اس کی واپسی کا منتظر تھا اور جہاں دار شاہ انگریزی مدد کا طالب کہ واپس جا سکے ۔ براؤن کی سازشیں بارآور نہ ہو سکیں اور پوری کوشش کے باوجود شاہ عالم مادھو جی سندھیا کی طرف جھک گیا ۔ اس زمانے تک عہد نامہ سلبئی کی مدد سے انگریز مرہٹوں کی کانفڈریسی توڑنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور نتیجے کے طور پر سندھیا مرہٹوں کا لیڈر ہوگیا تھا ۔ شمالی ہند میں درحقیقت وہی کرتا دھرتا تھا ۔ مرہٹے پھر شاہ عالم پر حاوی ہوگئے ۔ سندھیا کے میر بخشی ہو جانے کے بعد رہی سہی امید بھی جاتی رہی ۔ سندھیا جہاں دار شاہ کو واپس لینے پر آمادہ تھا لیکن وہ انگریزی فوج کے بغیر خود کو سندھیا کے چنگل میں دینے کے لیے تیار نہ تھا ۔ انگریز بھی اس موقع پر بیک وقت تخت کے دونوں دعوے دار (بادشاہ اور ولی عہد) مرہٹوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تھے ، اس لیے چپکے ہو گئے اور جہاں دار لکھنؤ ہی میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گیا ۔ اس سلسلے میں رتن سنگھ زخمی کا بیان بہت مبہم ہے ۔ ''انیس العاشقین'' میں فرماتے ہیں :

''جہاں دار نام نامیش مرزا جوان بخت جہاں دار شاہ خلف ارشد حضرت جنت آرام گاہ شاہ عالم بادشاہ غازی بودہ ، در عہد نواب مغفور مبرور آصف الدولہ چند بار بہ دارالامارۂ لکھنؤ تشریف آوردہ ، آخرالامر بہ بنارس رفتہ عازم تسخیر ملک عدم شد[۲] ''۔

---

۱ - ایک روایت یہ بھی ہے کہ افراسیاب کا قتل مادھو جی سندھیا کے ایما سے ہوا ۔

۲ - انیس العاشقین ـ ورق ۱۲۳ الف ، قلمی ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

(۷)

لکھنؤ میں آصف‌الدولہ جہاں دار شاہ کے مصارف کا کفیل تھا۔ جب اس کا قیام طویل ہوتا گیا تو وہ اسے اپنے پر بوجھ خیال کرنے لگا۔ بعض معاملات ایسے ہوئے کہ دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ مولانا نجم‌الغنی "تاریخ اودھ" میں لکھتے ہیں :

"نواب وزیر (آصف‌الدولہ) شاہزادے کی بہت خدمت کرتے تھے اور ۲۵ ہزار روپے ماہوار[1] مصارف کارخانہ جات وغیرہ کے لیے اور ۷ ہزار روپے خرچ باورچی خانہ کے لیے مقرر کیے۔ جیسا کہ "سلطان الحکایت" میں ہے۔ بعض قابو طلب لوگوں نے شہزادے کے مزاج کو عیاشی کی طرف مائل کر دیا اور فواحش و ارباب نشاط کی صحبت کی طرف راغب بنا دیا۔ چند روز میں رنڈی بھڑوے اتنے جمع ہوگئے کہ آسی شاہزادے کو شمشیر زنی، تفنگ افگنی، اسپ تازی اور نیزہ بازی کا عادی تھا، شاہد پرست اور عیش و عشرت میں محو بنا دیا۔ کئی فاحشہ عورتیں اپنے محل میں داخل کر لیں۔ نواب وزیر کو یہ باتیں ناگوار گزرتیں ... (انھوں نے آخر کار) سلوک بندگی و پرستاری اور ارسال پیش کش و ہدایا میں تغافل شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ طرفین کے دلوں میں کدورت پیدا ہو گئی اور "تاریخ شاہیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ میں ایک لکھنوی طوائف کریم بخش[2]

---

۱ - دراصل جہاں دار نے آصف‌الدولہ سے ۴ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ پایا تھا۔ نجم‌الغنی کا تخمینہ صحیح نہیں ہے۔

۲ - "دیوان افسوس" میں جہاں دار شاہ کی شادی کا ایک قصہ تاریخ درج ہے۔ دیکھیے :

Cat. of Hindi, Panjabi and Hindustani Mss. in B.M. (Blomhardt) p. 38.

جہاں دار اپنی اصل بیوی کو تو دلی چھوڑ آئے تھے جو مرزا بابا کی بیٹی جینا بیگم تھی، بعد میں انھیں لا کر اپنے پاس بنارس میں رکھا تھا ("نادرات شاہی"، دیباچہ صفحہ ۵۲)۔

(بقولے کرم بخش) نام سے جوش محبت میں آنکھیں لڑ گئیں اور اس کو کاشانہ محل بنایا ۔ اس سے وزیر کو رنج ہوا ... یہاں تک کہ وہ شہزادے سے بے رخصت ہوئے لکھنؤ سے فیض آباد کو چلے گئے ۔ اب شہزادے کو لکھنؤ کا ٹھہرنا ناگوار ہوا اور ماہ ذی حجہ کے عشرۂ دوم ۱۲۰۰ ہجری میں لکھنؤ سے بنارس کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں جا کر قیام کیا[۱] ۔

یہ اختلافات محض ظاہری ہیں ، حقیقت میں آصف الدولہ شہزادے سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جسے خواہ مخواہ انگریزوں نے اس پر لاد دیا تھا اور خاصا روپیہ برباد ہو رہا تھا ۔ اس لیے اس نے توہین آمیز روش اختیار کی جس سے دل برداشتہ ہو کر جہاں دار شاہ نے بے اطلاع نکلنے کی ٹھانی ۔ ۱۷۸۶ء کو جب آصف الدولہ فیض آباد گیا ہوا تھا شہزادہ لکھنؤ سے بنارس کی طرف چلا گیا اور مادھو داس کے باغ میں ڈیرہ جمایا ۔ آصف الدولہ اب جہاں دار شاہ کی مقررہ پنشن دینے پر آمادہ نہ تھا لیکن انگریزوں نے پھر مجبور کیا تو جہاں دار شاہ کو بنارس میں روپیہ ملنے لگا ۔

(۸)

جہاں دار کی شعر و شاعری کا زور شور لکھنؤ میں اپنے عروج پر رہا ۔ مشاعرے ہوتے ، شعرا کی سرپرستی کی جاتی اور محفلیں برپا ہوتی تھیں ۔ جہاں دار کے دربار سے میر شیر علی افسوس بھی متعلق ہو گئے تھے ۔ اس طرح کی مجالس کا ذکر مرزا علی لطف نے ''گلشن ہند'' میں کیا ہے ۔ لکھتا ہے :

> ''جس ایام میں کہ ناموافق سے امراء دولت کی ، نشان کیوان شان اس فلک جناب کے دارالخلافہ دلی سے بیچ حرکت کے آئے ، تو (۱۱۹۸) گیارہ سو اٹھانوے ہجری تھی کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے ۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب و آداب خدمت گزاری کے تھے ، سب ادا کیے ، خواص میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے

۱ - ''تاریخ اودھ'' (نجم الغنی) جلد سوم ص ۲۶۳ ، ۲۶۵ -

کھڑے رہے ۔ باوصف اس ناز برداری کے کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے ، پانچوں ہتھیار بند ہوئے ، ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرہ گاہ پر سے جا کر آداب بجا لائے تھے ۔ غرض اس شہزادۂ عالی کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی ۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے ۔ چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا ، تو اس ہیچمداں نے یہ عذر کہہ بھجوایا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ، از بس کہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے ، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں لاؤں" ۔ پذیرا نہ ہوا ؛ پھر چوب دار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ "نرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے ، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے" ۔ غرض ایسا سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا[1] ۔"

اس کے علاوہ کئی اور شاعر بھی جہاں دار شاہ کے متوسل رہے ۔ "مجموعۂ نغز" میں امین الدین خان امین کے حال میں لکھا ہے :

"امین الدین خان پسر قاضی وحید الدین مرحوم ... در جرگۂ خواصان مہین پور خلافت مرزا جہاں دار شاہ طاب اللہ ثراہ عز امتیاز داشت ، شعرش خالی از کیفیت نیست[2] "۔

اسی طرح تمنا شاعر کے حال میں ہے :

" محمد اسحاق خان مرحوم ۔ وی جوانی بود کشمیری الاصل ...

---

۱ ۔ "گلشن ہند" ص ۸۹ ، ۹۰ ۔

۲ ۔ "مجموعۂ نغز" (قاسم) صفحہ ۷۷ ۔

پسر ہم زلف احسن اللہ خان بیان - در سرکار گردون اقتدار شاہزادۂ نامدار کامگار مرزا جہان دار شاہ اثار اللہ برہانہ ثروتی بہم رسانیدہ بود ، بعد شنقار شدن آن شاہباز بلند پرواز اوج حشمت و جاہ بیاوری بخت بلند و مدد طالع ارجمند مختار کار سرکار دولت مدار خلف الصدق آن عالی نسب والا حسب یعنی مرزا شگفتہ بخت بہادر المعروف بہ مرزا حاجی صاحب شد - اما افسوس ہزار افسوس کہ در عین شباب چندان از عمر بہرہ ور نا گشتہ بہ رحمت حق پیوست[1] "۔

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ تمنا کا تعلق سرکار جہاں دار سے قیام بنارس تک رہا اور بعد میں ان کے فرزند کے ہاں بھی اسے ملازمت کا سر رشتہ ملا ۔

اسی طرح جعفر علی حسرت کے سلسلے میں لکھا ہے :

" در سرکار دولت مدار شاہزادۂ نامدار کامگار جہان دار شاہ اثار اللہ برہانہ در سلک ملازمان خاص عز امتیاز اختصاص داشت - در آخر ہا بہ ہدایت سعادت ازل و رہ نموئ فیض لم یزل از تعلقات دینوی وا رستہ سالک مسالک خدا جوئی گشت[2] "۔

اس کی تائید مصحفی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے :

"تا این مدت معاش بہ پیشۂ شاعری بسر بردہ ، آخر آخر چندی در سرکار صاحب عالم مرزا جہان دار ہم عز و امتیاز داشت - چون پدرش جہان فانی را پدرود کرد نوکریٔ صاحب عالم گذاشتہ خود بجای پدر دکان نشین گردیدہ بود کہ بہ یک نا گاہ بہ ایمای بزرگی خرقۂ درویشی پوشیدہ ترک لباس دنیاوی کردہ کنج عزلت اختیار نمود[3]" ۔

---

۱ - ایضاً صفحہ ، ۱۸۵ -
۲ - ایضاً صفحہ ۲۰۸ -
۳ - "تذکرۂ ہندی" (مصحفی) صفحہ ۴۷ -

"تذکرۂ مجمع الانتخاب" (کمال) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت نے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔ نیز چار سال قبل ترک دنیا کر چکے تھے اس لیے ۱۲۰۱ھ میں درویشی اختیار کر چکے ہوں گے اور ان کے باپ کا انتقال اس سے کچھ پہلے ہوا ہوگا[1]

اس کے علاوہ محمد ظہور نوا بھی جہاں دار شاہ کے متوسلین میں سے تھے۔ "مجموعۂ نغز" میں لکھا ہے:

"نوا تخلص شیخ محمد ظہور نوا، وی طالب علمی از طلبای بلدۂ لکھنؤ . . . شاگرد محمد بقا اللہ اکبرآبادی است از حضور سراسر نور مرشد زادہ جہان و جہاندار المعروف بہ مرزا جوان بخت مرحوم بخطاب مستطاب خوش فکر خانی عز امتیاز داشت"[2]۔

اس کی تائید مصحفی کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ نوا کو جہاں دار شاہ کے ہاں سے "خوش فکر خاں" کا خطاب ملا تھا[3]۔

لکھنؤ کی مجالس میں جہاں دار شاہ کی قدردانی اور شاعر نوازی کی داستان کے یہ چند ٹکڑے ملتے ہیں۔

لکھنؤ سے بنارس آ کر بھی محفل آرائی اور شعر خوانی کا زور قائم رہا۔ بنارس میں جو شعرا جہاں دار کے دامن سے وابستہ تھے ان میں طپش دہلوی کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے۔ "گلزار ابراہیم" میں نواب علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں:

"طپش دہلوی - از شاگردان خواجہ میر درد و منسلکان سرکار مرشد زادہ آفاق جہان دار شاہ صاحب عالم است، ہر گاہ کہ مرشد زادۂ آفاق رونق افزای بنارس بودند با راقم آثم

---

۱ - مفصل بحث کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب "میر حسن اور ان کا زمانہ" صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰ -

۲ - "مجموعۂ نغز" (قاسم) صفحہ ۲۸۶ -

۳ - "تذکرۂ ہندی" (مصحفی) صفحہ ۲۶۳ -

در ۱۷۹۸ء بہ مکرر ملاقات کردہ جوانی خوش ظاہر ، بہ صفت خاکساری و اخلاق آراستہ است"۱۔

(۹)

غم غلط کرنے کا اس سے زیادہ موثر طریقہ کیا ہو سکتا تھا کہ جہاں دار شاہ رنگ رلیاں مناتے رہیں ، اپنی انتظامی استعداد کو فراموش کر دیں ۔ انھوں نے تیموری سلطنت کو بچانے کے لیے برطانوی حکومت کو سہارا بنانا چاہا تھا اور ان کی حیثیت اب قیمتی مہرے کی سی ہو گئی تھی جس کی قیمت انگریزوں نے آصف الدولہ کے پیسے سے ادا کی تھی اور تخت کا ایک دعوے دار ان کی مٹھی میں تھا جسے بہ ضرورت کام میں لایا جا سکتا تھا۔ ۱۷۸۷ء میں دلی کے حالات نے پھر پلٹا کھایا اور شہزادے کے دل میں دوبارہ دلی جانے کا خیال بیدار ہوا ۔ جے پور اور جودھپور کے راجپوتوں کے ہاتھوں سندھیا کو پریشانی اٹھانی پڑی اور اس نے ادھر کا رخ کیا تھا کہ غیر حاضری میں سازش ہو گئی۲۔

غلام قادر روہیلے نے پانی پت اور دہلی کا رخ کیا اور اپنے موروثی عہدے کو عملی جد و جہد سے زندہ کرنے کی تگ و دو کی ۔ دربار میں ناظر منظور علی اس کا حواری موجود تھا جس کی مدد سے شاہ عالم کے ہاں باریابی ہو سکتی تھی ۔ سندھیا کے دو ایجنٹ جو اس کی غیر حاضری میں اس کے مفادات کے نگہبان ٹھہرے ، نالائق ثابت ہوئے ۔ غلام قادر دلی کی طرف بڑھا اور مرہٹوں کی بچی کھچی جمعیت کو شکست ہو گئی اور اس کے دونوں کارندے رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے ۔ شاہ عالم غلام قادر سے مفاہمت پر تیار ہو گیا ۔ ۲۶ اگست ۱۷۸۷ء کو غلام قادر ، شاہ عالم کے حضور میں پیش ہوا اور میر بخشی کا عہدہ اور جاگیر کا حق دار قرار پایا ۔ ۵ ستمبر ۱۷۸۷ء سے غلام قادر سلطنت کے کاروبار کا انچارج ہو گیا ۔ اب غلام قادر بخشی الممالک امیرالامرا روشن الدولہ بہادر کے لقب سے سرفراز ہوا ۔ شاہ عالم اس موقع پر بالکل عاجز و بے بس تھا ۔ وہ رہائی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی راستہ نہ ملتا تھا ۔ چنانچہ اس نے اطراف

۱ - "گلزار ابراہیم" (مع "گلشن ہند") صفحہ ۱۷۲ -

2. The Making of Indian Princes (Edward Thomson) pp. 9-10.

جہاں ان حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے -

و جوانب میں مدد کے لیے پکارا ۔ سندھیا کو بھی خط لکھا اور جہاں دار کو بھی ۔ ۷ ستمبر ۱۷۸۷ء کے خط میں جہاں دار کو حالات سے آگاہ کرکے واپسی کی دعوت دی گئی ۔ نواب آصف الدولہ اور گورنر جنرل سے بھی اپیل کی کہ داد رسی کریں[1] ۔ یہ حالات گورنر جنرل (کارنوالس) اور آصف الدولہ کے لیے بھی لمحۂ فکریہ تھے ۔ جہاں دار بنارس میں بے یار و مددگار پڑا تھا ، دلی میں غلام قادر ذلت و رسوائی کا سامان کر رہا تھا ۔ کارنوالس لکھنؤ جاتے ہوئے بنارس سے گزرا تو شہزادے نے اس سے علیحدگی میں گفتگو بھی کی[2] ۔

(۱۰)

بالآخر کارنوالس نے کسی امداد سے معذوری کا اظہار کیا لیکن اس بات کی ہامی بھری کہ اگر شہزادہ اپنے طور پر دلی جانا چاہے تو انگریزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ۔ جہاں دار نے اس غرض کے لیے پانچ ماہ کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ آصف الدولہ سے دلا دی جائے ۔ کارنولس نے وعدہ تو کیا لیکن آصف الدولہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ دینے پر رضا مند نہ ہوئے[3] ۔ اس حقیر رقم کو لے کر اور اپنے معمولی ذرائع کو کام میں لاکر جہاں دار نے دلی کا رخ کیا اور یہاں آکر عملی سیاست میں کود پڑا ۔ عبدالعلی کی رائے میں

1. Indian Historical Records Commission . . . . (Abdul Ali) p. 142.

۲ ۔ گورنر جنرل لکھنؤ گئے تو جہاں دار بھی پیچھے پیچھے لکھنؤ پہنچا ۔ دیکھیے ''تاریخ اودھ'' (نجم الغنی) جلد سوم صفحہ ۲۶۵ تا ۲۶۶ ۔

3. Indian Historical Records . . . (Abdul Ali) p. 142. I.R.D. Original Persian Letter بحوالہ

مرقومہ ۱۶ ستمبر ۱۷۸۷ء شمارہ ۶۵ء

اس مرحلے پر جہاں دار شاہ نے جارج سوم فرماں روائے انگلستان کو بھی خط لکھا تھا ۔ اس کا متن مع انگریزی ترجمہ دیکھیے در A History of the Reign of Shah-Aulum (Franklin) p. 243—249.

یہ مکتوب غالباً شاہ جارج تک کبھی نہیں پہنچ سکا (دیکھیے ایضاً صفحہ ۲۴۹ فٹ نوٹ) ۔

جہاں دار نے بڑی سعادت مندی سے باپ کی مدد کی تدبیر کی اور دلی کو مخالف عناصر سے پاک کرنے کے لیے شاہ عالم کو راست اقدامات پر اکسایا ؛ لیکن مخالف عناصر نے بادشاہ کو بدظن کر دیا اور یقین دلایا کہ جہاں دار خود بادشاہ بننے کی سوچ رہا ہے[1] لیکن سرکار کی رائے میں جہاں دار شاہ فی‌الواقع اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا[2]۔ سرکار کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے ، شاید اسی لیے شاہ عالم نے جہاں دار کو تیرہ دن کے مختصر قیام کے بعد ہی چلتا کیا - اسے آگرے کا صوبےدار بنا دیا گیا - یہ صوبہ ابھی تک اسماعیل بیگ کے قبضے میں تھا اور شاہ عالم اس پر کوئی اختیار نہ رکھتا تھا - ۲۳ دسمبر ۱۷۸۷ء کو شہزادہ اپنے بیوی بچوں کو ، جو فرار کے وقت دہلی میں رہ گئے تھے ، ساتھ لے کر آگرے پہنچا لیکن اسماعیل بیگ نے اطاعت سے انکار کیا - بے آسرا جہاں دار کو واپس انگریزی علاقے میں جانے کا پروگرام بنانا پڑا کیوں کہ اس کے پاس نہ کافی فوج تھی نہ روپیہ - اس نے انگریزوں کو مدد کے لیے لکھا بھی لیکن شنوائی نہ ہوئی - ادھر غلام قادر اسے اغوا کرنے کی تدبیر کر رہا تھا - ان حالات میں ناکام و نامراد واپس ہونے کے سوا چارہ نہ تھا[3] -

(۱۱)

مارچ ۱۷۸۸ء کو فرخ آباد پہنچ کر جہاں دار شاہ نے آصف الدولہ اور گورنر جنرل کو اطلاع دی اور لکھنؤ میں وارد ہوگیا - آصف الدولہ اس اس سنہری لاش کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا - چنانچہ "واقعات اظفری"

---

1. Indian Historical Records ..p. 142. See also A History of the Reign of Shah Aulum p. 158.
2. Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol III p. 306. also Indian Historical Records...... (Abdul Ali) p. 142—143.
3. Fall of the Mughal Empire p. 306—307.
سرکار نے اس کتاب کے صفحہ ۲۷۹ پر سنین و واقعات کو آگے پیچھے کر کے الجھا دیا ہے - یہاں مذکورہ بالا بیانات کو ترجیح دی گئی ہے -

میں اس موقع پر تلخ گفتگو کی کچھ تفصیل بھی ملتی ہے - اظفری لکھتے ہیں :

"چون بادشاه زادهٔ مذکور (جہان دار) بعد چند سال برای آوردن قبایل خود بی استرضای نواب وزیر (آصف الدولہ) با دہلی آمدند و لواحق خود را برداشتہ باز بہ لکھنؤ مراجعت نمودند ، مزاج لواب مسطور از بادشاه زادهٔ مذکور بسیار منحرف بود و از صحبت سابق خود را بر کنار می کشیدند و اگر گاہی (مذکور) بہ تکلف ملاقی می گردیدند صورت انبساط نمی دیدند ہی روزی در ہمین حالت ملالت بادشاه زاده مسطور چیزی دانہ الائچی وغیره بدست نواب وزیر دادند - نواب آداب تسلیات بجا آورده گرفتند و شرط یاد فراموش نمودند - بادشاه زاده مسطور فرمودند کہ "نواب بھائی فرامرش (نی)" - نواب وزیر جواب دادند کہ "انشا اللہ تعالیٰ الحال تا عمر فراموش (نکنم)" - پس بادشاه زاده این جواب حرافت و ملالت آمیز وزیر شنیده از تصفیۂ مابین مایوس گردیده ، بعد چند ماه در بنارس تشریف بردند و ہمونجا درماہۂ معینہ معرفت صاحبان عالی شان بہادر (انگریز) می رسید - بعد چندی در ہمون بلده داعی اجل را لبیک گفتہ -"[1]

آصف الدولہ جہاں دار کو اپنے خزانے کا غیر ضروری بوجھ تصور کرتا تھا ، نیز لکھنؤ میں ٹھہرنا بھی خلاف مصلحت جانتا تھا[2] آخر گورنر جنرل (کارنوالس) نے طے کیا کہ شہزادہ راج محل میں اقامت پذیر ہو - آصف الدولہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اخراجات کی کفالت کرے چنانچہ آصف لدولہ تین لاکھ روپے سالانہ دینے پر تیار ہوگیا - شہزادے کے

---

۱ - "واقعات اظفری" - قلمی ، پنجاب پبلک لائبریری ، ورق ۵۰ ب ۵۱ الف -

2. Historical Records Commission...(Abdul Ali) p. 143
I.R.D. Original Persian Letter بحوالہ received on 13rd March 1788 No. 174.

اخراجات اس سے زیادہ تھے اور عذر یہ تھا کہ پہلے اکیلا تھا تو چار لاکھ پاتا تھا اور بیوی بچے لے آیا تو تین لاکھ میں خرچ کیسے پورا کرے گا ! خاص کر جب کہ مرتبے کے لحاظ سے رکھ رکھاؤ بھی ضروری تھا ۔ جہاں دار کو تین لاکھ ہی قبول کرنا پڑا اور آسے فوری طور پر تلقین کی گئی کہ راج محل یا سہسرام چلا جائے جہاں رہائش زیادہ سہنگی نہیں تھی ۔ جہاں دار شاہ کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تھی اور اسے راضی ہونا پڑا ۔ اب وہ سفر کی تیاری کے لیے بنارس آیا جہاں اس کے اہل و عیال یکے بعد دیگرے بیمار پڑے اور سہسرام کی روانگی ٹلتی چلی گئی ۔ اس موقع پر اس کی بے بسی اور بے چارگی کا اندازہ اس خط سے بخوبی ہوتا ہے جو اس نے لارڈ کارنوالس کو لکھا تھا اور جس کے اقتباس کا ترجمہ عبدالعلی کے مقالے میں درج ہے[1] ۔ پریشانیوں اور الجھنوں نے جہاں دار کو کچل کر رکھ دیا ۔ ۳۱ مئی ۱۷۸۸ء کو چنار سے واپسی پر اسے سینے میں درد اُٹھا اور اگلے روز اس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی ۔

(۱۲)

جہاں دار کی وفات کی تاریخ ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ/یکم جون ۱۷۸۸ء ہے ۔ جناب امتیاز علی خاں عرشی کا خیال یہ ہے کہ انتقال ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ کے بعد کی کسی تاریخ کو ہوا ہوگا ۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"لالہ سری رام اور امیر احمد علوی صاحب نے سنہ ۱۲۰۱ھ میں جہاں دار شاہ کا انتقال لکھا ہے ۔ مگر بیل کہتا ہے کہ ۲۵ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ (۱۳ مئی ۱۷۸۸ء) کو فوت ہوئے" : (فٹ نوٹ) ۔ مجھے اس سنہ میں شک ہے ۔ اس لیے کہ انشائے لچھمی نرائن دبیر (ورق ۸۲ ب) میں ان کا ایک شقہ بہ نام شرف الدین حسین خاں نقل ہوا ہے اس میں شہزادے نے غلام نادر کی گستاخی کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ ہم لشکر لے کر دلی کی طرف جا رہے ہیں ۔ تم دولت تیموریہ کے پرانے

1. Ibid. p. 144.

I.R.D. Original Persian Letter received, 31st May 1788 N. 286.

بھی خواہ ہو ، اس شقے کو دیکھتے ہی ۱۰ ہزار چیدہ سوار ۵ ہزار پیادے ساتھ لے کر فرخ آباد میں ہم سے ملو - ۳ لاکھ روپے مصارف کے لیے خزانے سے بھیجے جا رہے ہیں - یہاں تمہارے پہنچنے پر داروغگیٔ توپ خانہ کا عہدہ عطا ہوگا - شاہ عالم ۷ ذی قعدہ سنہ ۱۲۰۲ھ کو نابینا کیے گئے تھے - غلام قادر خان ۱۲ ذی حجہ سنہ مذکورہ کو دہلی سے نکل کر ربیع الاول سنہ ۱۲۰۳ھ (دسمبر ۱۷۸۸ء) میں گرفتار ہوا ہے ، ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شقہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۰۲ھ اور ربیع الاول سنہ ۱۲۰۳ھ کے درمیان لکھا گیا ہوگا - اس صورت میں جہاں دار شاہ کا انتقال شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ میں کس طرح ہو سکتا ہے[۱]؟"

عرشی صاحب کو مغالطہ ہوا ہے - اس شقے میں شہزادے نے جس واقعے کا حوالہ دیا ہے وہ شاہ عالم ثانی کی کوری کا واقعہ (ذی قعدہ سنہ ۱۲۰۲ھ) نہیں بلکہ یہاں اس ذلت کی طرف اشارہ ہے جو شاہ عالم کو ۵ ستمبر ۱۷۸۷ ع کے فوراً بعد اٹھانی پڑی تھی - غلام قادر نے دلی میں داخلے کے بعد شاہ عالم کو دھمکایا تھا کہ اگر اس کی مرضی کے مطابق نہ چلا گیا تو وہ سلام کرنے کے لیے تخت پر کوئی دوسرا آقا بٹھا دے گا - اس واقعے کا ذکر شاہ عالم نے گورنر جنرل ، آصف الدولہ اور جہاں دار کے نام کے خط میں کیا تھا[۲] - بیل کے بیان کردہ سنہ وفات کی تائید قتلق سلطان (جینا بیگم) کے خط سے بھی ہوتی ہے - قتلق سلطان خود جہاں دار کے بستر مرگ پر موجود تھی[۳] اس لیے اس کا بیان سب سے زیادہ معتبر ہے - بیل نے ہجری تاریخ کو عیسوی میں بدلتے ہوئے ایک دن کا فرق ڈالا

۱ - "نادرات شاہی" (دیباچہ) صفحہ ۵۲ ، ۵۳ متن و حاشیہ -

2. Indian Records Commission......(Abdul Ali) p. 142
بحوالہ I.D.R. Original Persian Letter received 16 Sept. 1787

۳ - دیکھیے دیوان جہاں دار (مرتبہ وحید قریشی) ضمیمہ ۳ جس میں قتلق سلطان بیگم کا خط اور جہاں دار کی آخری دن کی دو تحریریں درج ہیں -

ہے اور اسے یکم جون کی بجائے ۳۱ مئی کا واقعہ قرار دیا ہے ۔ جنتری کے حساب سے ایک دن کا فرق ممکن ہے ۔ صحیح تاریخ ۲۵ شعبان ۱۲۲۰ھ/ یکم جون ۱۷۸۸ء ہے ۔

(۱۳)

جہاندار شاہ کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتا چلتا ہے :

۱ - ''دلی سے فرار کی داستان'' : اصل متن ناپید ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ (جو وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کے فارسی نویس منشی جونے تھن سکاٹ نے کیا تھا) چھپا ہوا موجود ہے ۔ دیکھیے ''Memoirs relative to the State of India.'' از وارن ہیسٹنگز طبع لندن ۱۷۸۶ء کے صفحات ۱۶۳ تا ۱۹۶ ۔

۲ - ''شعرا کا تذکرہ'' : 'طبقات شعرائے ہند' میں لکھا ہے کہ :
''(علی ابراہیم) بیان کرتا ہے کہ اس (جہاں دار) نے ایک تذکرہ اور تالیف کیا تھا لیکن یہ سب اس کے مر جانے کے بعد پورا نہ ہونے پایا ۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ کس طور پر وہ امام بخش کشمیری کے پاس رہ گیا جو اس نے اس کا انتحال (کذا) کر لیا[۱] ۔''

امام بخش کشمیری نے دراصل مرزا جہاں دار شاہ کے انتقال کے بعد اس کی بیاض نیز مصحفی کا تذکرہ شامل کر کے اپنا ''تذکرۃ الشعرا'' ترتیب دے لیا تھا ۔ چناں چہ مصحفی حقیقت کے حال میں لکھتے ہیں :

''میر شاہ حسین المتخلص بہ حقیقت شاگرد جرأت . . . بہ لکھنئو بہ سن تمیز رسیدہ . . . ملازادہ و خوشی بچہ است، پیش ازین درترک سواراں نوکر بود و درآن روزہای امردی و نومشقی اکثر بہ کتابت غزل ہای استاد خویش کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است، مصروف می ماند ۔ چون رسالۂ ایشان

۱ - طبقات شعرائے ہند (کریم الدین) صفحہ ۸۵ ۔

برہم خورد امام بخش کشمیری کہ باوصف جاہلی از مدتی خیال جمع کردن اشعار اساتذه در سر داشت ، روزی از جرأت درخواست شخصی کرد کہ ہم بہ تعلیم کو دکان متوجہ شود و ہم بہ نوشتن تذکرہ مصروف باشد ۔ مشارالیہ او را آوردہ روبرو کرد و منت بر طرفین گزاشت ۔ غرض کہ حسب الارشاد موبی الیہ ، بہ پشت گرمی کور موصلی کہ بہ ہمسری من می رود و در باطن تخم کینہ می کارد ، او ہم تذکرہ نوشتہ درست ساختہ است ؛ اما طرفہ این است کہ خان مذکور پیش ازین روزی بر مکان فقیر آمدہ بالحاح تمام مسودۂ خام تذکرہ مرا کہ درین مدت بہ ہیچ کس نہ نمودہ بودم ، از من طلب نمود ۔ من سادہ دل غافل از فطرت و بذاقی کشمیریان سابقہ معرفت شاہ جہان آباد آدمیت را کار فرمودہ اجزای مسودۂ تذکرۂ خود را حوالہ کردم ۔ در عرصۂ یک دو روز خفیہ از من اشعار و احوال شعرای دہلی وغیرہ کہ من بہ محنت تمام بہم رسانیدہ بودم ، از دست حقیقت بی حقیقت نقل کنانید و دیگر بیاض و جنگ جہان دار شاہ کہ بعد فوت ایشان پیش او ماندہ بود ، چیزی ازو و چیزی از جای دیگر اخذ نمودہ ، ہرگاہ مسودۂ تذکرۂ بی مغزش کہ آن را ہیچ دانا نہ پسندد ، فی الجملہ صورت گرفت ۔ روزی یکی از آشنایان جزو اول آن مجموعہ آوردہ بمن نمود ، غافل ازین مقولہ کہ گفتہ الد ۔ شعر :

پنیری آب دادن نشاید بہ میش
کہ بیند درو قطرۂ خون خویش

چون درو نظر کردم دیدم کہ ہمین تخلص آفتاب و آصف بطور تذکرۂ من درو نوشتہ است ۔ بسیار برہم شدم و تفحص احوال کردم ۔ مشارالیہ حقیقت تذکرہ نویسانیدن امام بخش خان بگوش من رسانیدہ ، اگرچہ مرا در بادی‌النظر از حرکت این اصحاب ثلاثہ آزردگی ، کمال بہم رسانیدہ بود ، قریب بود کہ ہجو از من سر زند ، اما چون عبارت ہیچ و غلطی احوال و اشعار شعرا را در آن جریدہ سمت تحریر یافتہ نگاہ کردم آسودہ شدم و

در گزشتم و بر ہمین قطعہ طبع زاد خود و یک بیت مولانا جامی اکتفا کردم :

قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک مدت یہاں
مصحفی کے تذکرہ کا شور ہے
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا
بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

اگر بر فروزی چو مہ صد چراغ
ز خورشید باشد برو نام داغ

غرض کہ جای علی قلی خان است[1] ۔"

۳ ۔ "دیوان جہاں دار "۔۔معلومہ لائبریریوں میں اس کے صرف دو قلمی نسخوں کا علم ہے ۔ ایک انڈیا آفس کا نسخہ جو وارن ہیسٹنگز کو خود شہزادے نے پیش کیا تھا اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ جو ذخیرۂ آذر میں ۸۲۰۸ پر موجود ہے ۔

(۱۳)

صرف جہاں دار ہی شعر و شاعری کا ذوق نہیں رکھتے تھے بلکہ اس خانوادے کے بعض دوسرے لوگ بھی شاعری سے بہرہور اور شعرا کے قدردان تھے ۔ باپ (شاہ عالم) کے علاوہ حقیقی ماموں بھی شاعر تھے ۔ "مجموعۂ نغز" میں "اکبر" تخلص کے تحت لکھا ہے :

"اکبر ، مکرم الدولہ سید اکبر علی خاں بہادر مستقیم جنگ برادر حقیقی عصمت قباب نواب تاج محل صاحبہ والدہ ماجدۂ مرشد زادۂ جہان و جہانیان جوان بخت مرزا جہاں دار شاہ

۱ ۔ "تذکرۂ ہندی" (مصحفی) صفحہ ۸۷ ، ۸۸ ۔

بہادر انار اللہ برہانہ - وے جوانے بود نیکو محضر ، پاکیزہ سیر ، خوش اختلاط ، با تمکین ، نیک معاش ، طبع رنگین ، ذی شوکت و جاہ ، باثروت (و) حشمت پناہ - در علم موسیقی دستے داشت - گاہی بفکر ریختہ ہمت می گماشت - از چندے بجوار رحمت حق پیوستہ[۱] "۔

چھوٹا بھائی جو بھائی کی وفات کے بعد ولی عہد سلطنت ہوا وہ بھی شاعری کا ذوق رکھتا تھا اور شعاع تخلص کرتا تھا[۲] ، اسی طرح شہزادہ سلیمان شکوہ صاحب دیوان اور لکھنؤ کے شعرا کا مربیؑ خاص تھا - جہاں‌دار کی بیگم تغلق سلطان (جینا بیگم) بھی شاعرہ تھیں[۳] - بڑا بیٹا مرزا شگفتہ بخت بہادر عرف حاجی صاحب کے بارے میں "مجموعۂ نغز" میں ہے :

"مرزا شگفتہ بخت بہادر عرف مرزا حاجی صاحب خلف الصدق صاحب عالم و عالمیان مرشد زادۂ جہان و جہانیان ، مرزا جوان بخت جہاں دار شاہ بہادر انار اللہ برہانہ کہ با پدر والا قدر بممالک شرقیہ تشریف شریف ارزانی فرمودہ ، بہ محمد آباد بنارس طرح اقامت افگندہ بہ ترفہ و تعیش ایام خجستہ فرجام بسر می فرمایند - سران آن جا سعادت خود انگاشتہ حوائج ضروریہ سرکار دولت مدار آن کامگار می رسانند - از طبع وقاد جناب ایشان گاہ گاہ شعر ریختہ بسیار پاکیزہ و پُر مزہ می ریزد[۳] "۔

اس شہزادے کے متوسلین میں میر حیدر علی خان حیدر کا ذکر بھی پایا جاتا ہے :

"میر حیدر علی خان - وی از اولاد امجاد حضرت ... غوث صمدانی است ... مولدش دارالسلطنت لاہور و اکثر اوان و فرخندہ تواماں زندگانیش بنواح دہلی و دیار شرقیہ انجام رسانیدہ و گرم

---

۱ - مجموعۂ نغز (قاسم) صفحہ ۶۷ -

۲ - ایضاً صفحہ ۳۴۳ ، ۳۴۴ -

۳ - ایضاً صفحہ ۱۶۸ -

۴ - مجموعۂ نغز (قاسم) جلد دوم ، صفحہ ۳۴۸ -

و سرد زمانہ بسیار دیدہ ۔ مدتے بہ بلدۂ محمد آباد بنارس مصاحبت شاہ زادہ نامدار کامگار مرزا شگفتہ بخت بہادر دام اجلالہ مختار و سرفراز بود[1] "۔

شگفتہ بخت کے علاوہ جہاں دار کے دوسرے لڑکے مرزا خرم کے ملازموں میں لالہ ٹیک چند اخگر شاعر ہو گزرا ہے :

"اخگر تخلص لالہ ٹیک چند دیوان مرزا خورم (کذا) صاحب فرزند ارجمند مرزا جہاں دار شاہ مرحوم است[2] "۔

جہاں دار کے تیسرے صاحب زادے مرزا عالی قدر کے بارے میں معلوم نہیں کہ شعر کا ذوق رکھتے تھے یا نہیں ۔ خاندان کا حال بتاتے ہوئے لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" میں لکھتے ہیں کہ آپ (جہاں دار) کی اولاد کا سلسلہ بنارس میں اب تک موجود ہے[3] ۔

---

۱ - ایضاً صفحہ ۲۲۶ -
۲ - ایضاً (جلد دوم) صفحہ ۳۷۸ -
۳ - "خمخانۂ جاوید" (جلد دوم) صفحہ ۳۲۲ -

مقدمہ کلام آتش۔تحقیقی جائزہ

(۱)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کا نام اردو ادب کے لیے نیا نہیں ۔ اول اول ان کی شہرت کلام آتش کے جائزے کی وجہ سے ہوئی جسے انھوں نے رسالہ نگار میں قسط وار شائع کیا ۔ کلام آتش کے مطالعے کا انھوں نے ایک نیا زاویہ دریافت کیا تھا اس لیے اس مضمون کی بڑی قدر ہوئی اور اسی زمانے میں اس سلسلہ مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی ، لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں اس سے پہلے چھپ گئیں ۔ فکر و فن ، کاغذی پیرہن اور نوائے ظفر (جو کلام آتش کے بعد کی چیزیں ہیں) پہلے شائع ہو گئیں اور اس کتاب کی اشاعت کی نوبت کہیں دسمبر ۱۹۵۹ء میں آئی ۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور کا دیباچہ بھی ہے جس میں بعض بڑے عجیب و غریب دعوے کیے گئے ہیں ۔ سرور صاحب کی تنقید بہت کچھ ادبی چٹخارہ رکھتی ہے اس لیے اگر وہ کوئی غلط بات بھی کہتے ہیں تو انداز بیان کی دلکشی پردہ پوش ہو جاتی ہے ۔ اس مضمون میں بھی ان کے انداز بیان نے اکثر غلط بیانات کی پردہ پوشی کی ہے ۔

(۲)

ڈاکٹر خلیل الرحمن نے کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے ، پہلے باب میں آتش کے حالات زندگی ترتیب دیے گئے ہیں ، دوسرے باب میں آتش کے بارے میں نقادوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ درج ہے ، تین ابواب میں آتش کے فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے ، چھٹے باب میں آتش کی عشقیہ شاعری ، ساتویں میں خمریات ، آٹھویں میں تصوف اور نویں میں مسائل حیات کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

کتاب کا سب سے اچھا حصہ وہ ہے جو پہلے دو باب چھوڑ کر شروع ہوتا ہیں - ڈاکٹر اعظمی نے آتش پر یہ مونوگراف لکھ کر اردو ادب میں علمی کام کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے - وہ ان ترقی پسند نقادوں میں سے نہیں ہیں جو محض رٹے رٹائے جملوں کی مدد سے شاعر کو اپنے ذاتی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ بناتے ہیں - ڈاکٹر صاحب کلام کا جائزہ لینے سے پہلے شاعر کے ماحول اور اس کے حالات زندگی کو بھی تفصیل سے دیکھتے ہیں - آتش کی زندگی ، شخصیت اور فن کے درمیان ڈاکٹر صاحب کو ایک بنیادی ربط دکھائی دیتا ہے - انھوں نے آتش پر تالیف کے زمانے تک رسائل و کتب میں جو کچھ شائع ہوا تھا یکجا کر کے اس کے بعض بنیادی علمی مباحث تک رسائی حاصل کی ہے ، اس لیے آتش کے حالات زندگی اور شخصیت پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت مضبوط ہے ؛ لیکن کہیں کہیں ان سے معمولی فروگزاشتیں بھی ہوئی ہیں ، مثلاً صفحہ ۱۹ پر وہ آتش کی پیدائش کے سنہ کا تعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"آتش کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی ، سنہ پیدائش کی صحیح تحقیق نہ ہو سکی - مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر ۲۹ سال بتائی ہے - مصحفی نے یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۲۳۶ھ میں اس کی تکمیل کی ، کیونکہ آتش کے حالات تذکرے کے شروع ہی میں درج ہیں اس لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ آتش ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے - خواجہ عبدالرؤف عشرت کے ایک بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے .. اس اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی خان خاناں کی پوتی سے کی ، جس میں ۲۴ لاکھ روپیہ صرف کیا - یہ واقعہ (۱۷۷۶ء) ۱۱۸۸ھ کا ہے - یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ علی حیدر آتش پیدا ہوئے ، یعنی نواب آصف الدولہ کی شادی سے تین سال بعد آتش کی پیدائش ہوئی - کیونکہ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس لیے اس کی چہل پہلے اور رنگ رلیاں کئی سال تک باقی رہی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بعض اعتبارات سے محل نظر ہے ، مثلاً ان کا یہ اصول کہ جس شاعر کا حال تذکرے کے شروع میں ہو اس کے حالات لازماً ابتدائی سال ہی میں لکھے گئے ہوں گے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ عشرت کا بیان جو انھوں نے اپنے قیاس کی تائید میں استعمال کیا ہے وہ بھی کچھ ایسا درست نہیں ۔ عشرت نے آصف الدولہ کی شادی کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۱۸۸ھ کا نہیں بلکہ ۱۸۸۵ھ کا واقعہ ہے ۔ اس طرح ان کے موجودہ سنہ پیدائش اور آصف الدولہ کی شادی کے درمیان سات برس کا فرق ہو جاتا ہے ۔ اس شادی کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ اس کی چہل پہل اور رنگ رلیاں کئی سال تک باقی رہی ہوں گی حقیقت کے خلاف ہے ۔

صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

"فیض آباد میں آتش کی شاعرانہ صلاحیت اور سپاہیانہ بانکپن نے نواب محمد تقی خان ترقی کو متاثر کیا جو شعر اور سپہ گری دونوں کے دل دادہ تھے ۔ آتش اور ناسخ دونوں نے نواب صاحب کی ملازمت اختیار کی ، جب نواب صاحب غازی الدین حیدر کے عہد میں فیض آباد سے ترک سکونت اختیار کر کے لکھنؤ آ گئے تو آتش نے بھی لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا ... اسی زمانے میں آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے ۔"

نواب محمد تقی خان ترقی کے حالات قیصر التواریخ[۱] ، تاریخ اودھ (نجم الغنی)[۲] اور تاریخ فرح بخش میں پائے جاتے ہیں ۔ تاریخ فرح بخش[۳] میں محمد تقی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۲۳۰ھ میں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے گویا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہی وہ زمانہ ہے جب آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے ؛ لیکن صفحہ ۱۹ پر ڈاکٹر صاحب نے خود لکھا ہے کہ مصحفی نے آغاز تذکرہ کے وقت ۱۲۲۱ھ کے لگ بھگ آتش کا ذکر کیا ہے ۔ مصحفی نے آتش کے حال میں اسے اپنا شاگرد بیان کیا ہے لیکن

---

۱ - جلد اول صفحہ ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۱۹۳ -
۲ - جلد چہارم صفحہ ۳۲۳ -
۳ - انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحہ ۲۶۶ ، ۲۹۳ ، ۳۰۲ -

۱۲۲۱ھ میں غازی حیدر کا زمانہ نہیں ہے - غازی الدین حیدر کی تخت نشینی ۱۲۲۹ھ میں ہوئی ، اس لیے ڈاکٹر صاحب کا پہلا استدلال غلط ہے - ہمارے خیال میں مصحفی نے آتش کا حال ۱۲۳۰ھ اور ۱۲۳۶ھ کے مابین لکھا - اگر ۱۲۳۰ھ میں داخل تذکرہ کیا ہو تو پیدائش ۱۲۰۱ھ میں ہوئی ورنہ محتاط طریق بیان یہ ہے کہ آتش کی پیدائش ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۷ھ کے مابین ہوئی -

ڈاکٹر صاحب صفحہ ۲۲ پر فرماتے ہیں :

''لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد نواب محمد تقی خان ترق کا انتقال ہو گیا'' -

کچھ ہی دنوں بعد کا ٹکڑا سمجھ میں نہیں آتا - محمد تقی خان ترق ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ آ گئے اور ۱۲۳۳ھ تک یقیناً زندہ تھے![1] -

(۳)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تنقید میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں - وہ فراق گورکھپوری کے تاثراتی انداز سے بھی متاثر ہیں ، لیکن فراق صاحب کے مقابلے میں زیادہ واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں - لکھنؤ کی شاعری اور کلام آتش پر اس کے اثرات کو انہوں نے بڑے اچھے انداز سے بیان کیا ہے - فرماتے ہیں :

''آتش کے کلام میں زائد عناصر کا سبب لکھنؤ کا وہ شاعرانہ ماحول ہے جہاں دو غزلے سہ غزلے لکھنا ، ایک غزل میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ شعر نکالنا ، ایک قافیے کو پانچ چھ بار باندھنا اور اس سے نئے نئے مفہوم پیدا کرنا ، لفظی رعایت اور مناسبت کا خیال رکھنا کمال فن سمجھا جاتا تھا - آتش بھی لکھنؤ میں استادی کے مرتبے پر فائز تھے اور سیکڑوں شاگردوں کی رہنمائی اور اصلاح کے علاوہ انھیں اپنے حریف ناسخ کو نیچا

---

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ اودھ (جلد چہارم) ص ۱۲۸ ، ۱۳۶ ، ۱۶۷ -

دکھانے کی بھی بڑی رہتی تھی۔ اس لیے اس طرز کی غزل گوئی سے انھیں مفر نہ تھا ۔ لیکن آتش اور ناسخ دونوں کی شخصیتوں میں فرق تھا ۔ ناسخ کے پاس صرف کرتب تھا ، استادی اور زبان دانی کا دعویٰ تھا ؛ لیکن آتش اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے ۔ وہ وجدان اور احساس جمال کے مالک تھے اور ان کے حواس خمسہ پورے طور پر بیدار تھے ۔ زندگی کے گونا گوں تجربات سے متاثر ہونا اور انھیں ہضم کر کے اپنی تخلیقات میں آب و رنگ دینا بھی انھیں آتا تھا ۔ اس لیے جب بھی ان کے اندر کا شاعر بیدار رہتا تھا اور جذبۂ تخلیق ان کا ساتھ دیتا تھا وہ حقیقی شاعری کا دامن نہیں چھوڑتے تھے ۔ چونکہ ان کا بہترین کلام سچے انسانی جذبات و احساسات سے معمور ہے اس لیے وہ موثر ہے لیکن فنی تکمیل میں وہ ناسخ کے بھی مرہون منت ہیں ۔ یہ اس طور پر کہ اصلاح زبان کی تحریک کے اثر سے اس وقت لکھنؤ کی زبان میں جو تراش خراش ہو رہی تھی ، جو سلاست و روانی ، جو چستی و صفائی اور جو نکھار پیدا ہو رہا تھا ، اس سے آتش نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا" (ص ۸۸) ۔

اس اقتباس کے پہلے حصے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ادب کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن دوسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اس کی کڑیاں آتش کی شخصیت اور فن کے ساتھ ملا کر لکھنوی شاعری کے اثرات کو جس انوکھے زاویے سے پیش کیا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے ۔ عام نقاد تنقید میں بات کو جہاں لا کر ختم کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے استدلال کا آغاز وہاں سے کر کے شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویہ اختیار کرتے ہیں ۔ یوں نیا زاویہ دریافت کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ نیا زاویہ شاعر کے کلام کی مدد سے پوری طرح ثابت بھی کر دیا جائے اور قاری کو یہ یقین ہو جائے کہ جس نظر سے وہ شاعر کو پہلے دیکھ رہا تھا وہ کچھ ایسی صحیح نہ تھی اور جس زاویے سے اب دیکھ رہا ہے وہ شاعر کو سمجھنے کے لیے بہترین نقطہ آغاز ہے تو پھر ڈاکٹر صاحب کے نتائج کی صحت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے ۔

آتش کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"فن شعر میں تشبیہ و استعارہ جہاں شعر کے حسن میں اضافہ کرتا ہے وہاں کبھی کبھی فنکار کے عجز کو بھی ظاہر کرتا ہے ۔ تشبیہ و استعارہ زندگی کے ٹھوس مادی حقائق ، تلخ ترین تجربات کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالنے کا موزوں ترین وسیلہ ہے ، لیکن جب شاعر کے یہاں یہی شے مقصود بالذات بن جائے تو اس کے اشعار تاثیر سے دور جا پڑتے ہیں اور شعر محض بازی گری کا نمونہ ہو کر رہ جاتا ہے ۔ آتش نے اپنے تجربات و احساسات کے اظہار کے لیے جہاں بھی اس وسیلے کی تلاش کی ہے وہاں اپنی شخصیت کے وجدانی اور جمالیاتی عناصر کی مدد سے ان تشبیہات و استعارات میں نئی جان ڈال دی ہے (ص ۹۹) ۔

آتش کی عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

اگر ہم آتش کی عشقیہ شاعری کا مطالعہ کریں تو اس کی انفرادیت کئی اعتبار سے ہمارے سامنے اُبھر آتی ہے ۔ ایک طرف تو یہ شاعری بازاری محبت اور ہوس ناکی کی ڈگر سے علیحدہ سچی اور پُر خلوص محبت اور لطیف ترین انسانی تعلق کی بنیاد پر ہے ، دوسری طرف یہ اس پُر خلوص عشقیہ شاعری سے ایک علیحدہ فضا قائم رکھتی ہے یہاں صرف ناکامی و نامرادی ، یاس و حسرت اور ہڈیوں کو پگھلا دینے والے غم سے واسطہ پڑتا ہے اور باوجود صداقت شعری کے کبھی کبھی اس سے طبیعت دب جاتی ہے ۔ کیونکہ یہ عشقیہ شاعری تمام کیفیات کو صرف ایک مرکز پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور یہ ہے عاشق کے دل کا درد اور اس کا داخلی سوز و گداز ۔ یہاں ہم کو محبوب کے جمال سے کم از کم واسطہ پڑتا ہے اور نہ اس کی شخصیت ہی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہم دیکھ سکتے ہیں اس لیے یہ شاعری بعض اوقات ہماری بہت سی جذباتی اور جمالیاتی کیفیات کا ساتھ دینے میں ناکام رہتی ہے اور ہمیں پورے طور

ہو تسکین نہیں ہوتی ۔ آتش نے لکھنؤ کے نشاطیہ ماحول اور اپنی شخصیت کے کس بل کو آمیز کر کے اپنی عشقیہ شاعری میں کچھ ایسی فضا دی ہے جہاں شعرائے دہلی کے برخلاف ہمیں محض نامرادی و یاس انگیزی سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ اس میں محبوب بھی اپنی مکمل جلوہ سامانیوں کے ساتھ آتا ہے ۔ جہاں عاشق اور معشوق دونوں اپنی نفسیات کے ساتھ ملتے ہیں اور اس طور پر ایک بھرپور عشق کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ آتش کی شاعری میں عاشق میں بھی بانکپن رہتا ہے اور محبوب بھی اس کی دل جوئی اور وفاداری میں بہت کچھ اس کا ساتھ دیتا ہے ۔ یہ محبوب بازاری نہیں ہے بلکہ عصمت و حیا اور عفت و پاکیزگی کے ان تمام زیوروں سے آراستہ ہے جس کی محبت کی قسم کھائی جا سکتی ہے ۔ یہ فضا آتش کی عشقیہ شاعری کو رنگا رنگ اور وسیع بناتی ہے اور اس میں نشاط و سرمستی ، لطافت و نزاکت ، جاں سپاری و دلنوازی کے ایسے ایسے پہلو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس سے ہم پر ایک خوش گوار اور صحت مند اثر ہوتا ہے" (ص ۱۰۹ - ۱۱۰) ۔

اسی طرح آتش کی شاعری کے صوفیانہ پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے :

"آتش کی صوفیانہ شاعری کو فارسی کی صوفیانہ شاعری کے اعلیٰ معیار سے دیکھا جائے تو شاید یہ حصہ اپنی شعریت اور تاثیر کے لحاظ سے کمزور نظر آئے گا کیونکہ صوفیانہ شاعری میں کیفیت پیدا کرنے کے لیے جس سوز و گداز ، سپردگی و محویت و رقیق القلبی کی ضرورت ہے وہ آتش کی شخصیت اور مزاج کا عنصر نہیں ہے ؛ لیکن جب ہم لکھنؤ کے تاریخی پس منظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے ۔ آتش نے اپنی افتاد طبع اور رجائی نقطہ نظر کی بنا پر تصوف کو اپنے نقطہ نظر یا اس زاویے سے استعمال کیا ہے کہ اس سے مثبت نتائج نکل آئے ہیں اور بجائے یاسیت اور قنوطیت یا زندگی سے گریز کے ایک طرح کی قوت نمو ملتی ہے" (ص ۱۳۳ - ۱۳۴) ۔

(۴)

ان اقتباسات سے تنقید میں ڈاکٹر صاحب کے عام رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ نہ ماحول کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے پیشہ ور ترقی پسندوں کی طرح اصل شاعر کو نظر انداز کر دیتے ہیں ، نہ تاثراتی نقادوں کی طرح انفرادی خصوصیات پر زور دے کر لیا ہیرو دریافت کرتے ہیں ۔ شاعر کے کلام کے مطالعے سے انھوں نے بعض بنیادی رجحانات دریافت کیے ہیں اور انھیں شاعر کے ماحول اور اس کی شخصیت کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے ۔ اردو شاعروں کا اس نوعیت کا مطالعہ ابھی ہمارے ہاں رواج پذیر نہیں ہوا ۔ اردو ادب کو یا تو ایسے نقاد ملے ہیں جو محض تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نکالنے کے ماہر تھے یا پھر ایسے نقادوں سے پالا پڑا ہے جو اردو شاعری کے پس منظر سے کچھ واقفیت نہیں رکھتے ، محض اندازے اور اٹکل سے تنقید کرتے ہیں ۔ اعظمی ان چند نقادوں میں سے ہیں جن پر ان میں سے کوئی لیبل بھی نہیں لگایا جا سکتا ۔ وہ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے ہیں ، قدیم ادب سے انھیں لگاؤ بھی ہے اور اس ماحول کو بھی سمجھتے ہیں جس میں ہمارے شاعر زندگی بسر کرتے تھے ۔ انھیں موازنے کا وہ شوق بھی نہیں ہے جو غالب کو گوئٹے اور نظیر اکبر آبادی کو شیکسپیئر سے ٹکرا دیتا ہے ، اس لیے ان کے نتائج بڑی حد تک صحیح ہیں ۔ تنقیدی اصولوں کے بارے میں ان کا ذہن بہت سے نقادوں کے مقابلے میں صاف ہے ۔

گلستان سخن ایک تجزیہ

(۱)

شاہ زادہ قادر بخش صابر ، مغلیہ خاندان کا چشم و چراغ ، جس کے خاندان میں کئی اردو اور فارسی کے شاعر گزرے ہیں ، شعر و شاعری میں دسترس رکھتا تھا ۔ اس کا ثبوت اس کے دیوان 'ریاض صابر' سے بہ خوبی ہو سکتا ہے ۔ گلستان سخن میں بھی اس کے جو حالات درج ہیں ان سے ان کی شعرگوئی کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہتی ، لیکن تذکرہ نگاری کی بات دوسری ہے ۔ اس میں خود گلستان سخن کی ابتدائی اشاعت میں سرورق کی عبارت ہے کہ یہ صہبائی کی اصلاح سے مزین ہے اور صابر کے معاصر تذکرہ نگاروں میں بھی بعض اسے صابر کی تصنیف نہیں مانتے ؛ باوجودیکہ سرورق پر صابر کا نام بہ طور مصنف درج ہے ۔ شاہ بہاؤ الدین بشیر معروف بہ عبداللہ شاہ ، جو شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین کے حقیقی نواسے تھے اور جنھوں نے (بہ قول صاحب 'خم خانۂ جاوید' جلد اول ، ص ۶۹۷) ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ وفات پائی ان کا بیان ہے[1] :

> "گلستان سخن ۱۲۷۱ھ صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کے نام سے مشہور ہے ، مگر حقیقت میں ان کے استاد مولوی

---

۱ - گارسیں دتاسی نے اردو تذکروں پر ۱۸۵۵ء میں ایک کتابچہ لکھا تھا ، اس کی اشاعت کے دوسرے سال شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا (گارساں دتاسی از ڈاکٹر زور ص ۴۳) ۔ خوش قسمتی سے یہ ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس کے حاشیوں پر بغیر دستخطوں کے تحریری حواشی درج ہیں ۔ یہی تحریریں بعض دوسری کتابوں پر موجود ہیں اور وہاں

امام بخش صہبائی جنت ماوائی کی تصنیف ہے - اس کی عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں اور اس شہر کے خاص خاص اشخاص کو یہ حال معلوم ہے -۱ "

پھر فرماتے ہیں :

" گلستان سخن ۱۲۷۱ھ مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے - اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے -۲ "

دوسری معاصر شہادت غالب کی ہوسکتی ہے لیکن ان کے بیانات متضاد ہیں - ایک خط میں وہ ذکاء کو لکھتے ہوئے گلستان سخن کو صابر کا تذکرہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے انھوں نے شفیق کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ "صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کر رہا ہوں" - معلوم نہیں اس مقام پر اس سے مراد گلستان سخن ہے یا صہبائی کے انتخاب دواوین کا ذکر کر رہے ہیں جو خود ایک تذکرے کی حیثیت

باقی فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۱

بشیر کا نام صاف طور پر مرقوم ہے - اس لیے یہ حواشی ، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ، بشیر ہی کے لکھے ہوئے ہیں - ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں گلستان سخن تکمیل کو پہنچا تھا اس لیے مقالہ' دتاسی کے متن میں اس تذکرے کا ذکر نہیں ہے ؛ لیکن طبع ثانی کے وقت ، جس کی نوبت ۱۸۶۸ء میں آئی ، گارسیں دتاسی نے نظر ثانی کی اور دوسرے ایڈیشن میں گلستان سخن کے بارے میں وہ عبارت شامل کر دی جو 'خطبات گارساں' میں لکھی گئی تھی - ڈاکٹر ریاض الحسن نے رسالہ 'اردو' جنوری ۱۹۵۰ء میں گارسیں دتاسی کے مقالے کی اسی طبع ثانی کا اردو ترجمہ اردو تذکرے کے عنوان سے شائع کیا بہ ظاہر ریاض الحسن ، ذکاء اللہ کے اردو ترجمے سے ناواقف ہیں -

---

۱ - حاشیہ اردو تذکرے ص ۱۳ -

۲ - ایضاً ص ۱۷ -

رکھتا ہے ۔ عبدالغفور نساخ 'سخن شعراء' میں 'گلستان سخن' کو صہبائی کی تصنیف قرار دیتے ہیں ۔ ان کا اقتباس یہ ہے :

"تذکرہ گلستان سخن ان (صابر) کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے ۔[1] "

دور حاضر میں بھی یہ اختلاف چل رہا ہے ۔ چنانچہ 'خم خانہ جاوید' از لالہ سری رام دہلوی میں دیباچے کے پہلے اور دوسرے صفحے پر ہے :

"اس خیال سے مختلف تذکروں کی فراہمی اور مطالعہ شروع کیا ، مگر افسوس ان میں سے کوئی بھی دل میں نہ کھبا ۔ آب حیات ، جو تلاش و تحقیقات کی انتہا ، تنقید حسنہ کا قابل قدر نمونہ اور اردو ادب و زبان کی خدمت میں ایثار کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور اعلیٰ انشاءپردازی کا ایک بے مثال مرقع ہے ، اس کی نسبت شروع سے میرا یہ خیال تھا کہ یہ تذکرہ محققان زبان و مشتاقان عروض اور خاص کر مشتاقان انشاء پردازی کے حق میں خضر راہ ہوگا اور آب حیوان کا کام دے گا ، مگر جب مجھ تشنہ لب سخن کی ان اوسوں سے پیاس نہ بجھی تو کسی دوسرے سر چشمے کی تلاش ہوئی کیونکہ اس کے جامع نے اول تو اس میں خاص الخاص چند مشاہیر شعراء کے حال اور برائے نام کلام کے سوا دیگر مشتاقان سخن سے غرض نہیں رکھی ، دوسرے کلام بھی لیا تو بہ طور نمونہ ہی لیا ، انتخاب کا حظ نہ آنے دیا ۔ گو انھوں نے مجبوراً یہ امر اختیار کیا ورنہ چار دور کیا وہ ایک دور کے شاعر بھی نہ لکھ سکتے ۔ مگر اس سے وہ بات نہ ہوئی جس سے اپنی طبیعت کھلتی اور ان اہل درد کا میلان طبع معلوم ہوتا ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو جدید و قدیم بیسیوں تذکرے دیکھ ڈالے ، سیکڑوں بیاضیں وقف نظر کر دیں ، لیکن افسوس صد افسوس جملہ تذکروں کو عام اور ہمہ‌گیر نہ پایا ۔ ان مدونوں نے رطب و یابس ، خاص و عام بلکہ عوام الناس میں بھی کچھ تمیز نہ

---

۱ ۔ سخن شعراء ص ۲۷۲ ۔

رکھی - یہاں تک کہ بعض تذکرے تو عامیانہ درجے پر پہنچ گئے - بھرتی کے شاعروں اور ان کے کلام کی وہ بھرمار دیکھی کہ ان سے طبیعت بھر گئی - اس طوفان بے تمیزی میں تو لنگڑے لولے ہر قسم کے سوار بھرتی تھے ، جنہیں قافیے کی خبر ، نہ ردیف کی سدھ ، خوبیٔ مضمون سے بحث ، نہ موزونیت سے لہنا -

ہاں گلستان سخن ، گلشن بے خار اس سے مستثنیٰ ہیں - یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور دل سے پسند آئے - ارکان تذکرہ نویسی سے مالا مال ، محققانہ پابندی سے اپنے مدونوں کا کمال دکھا رہے تھے - لیکن گلستان سخن نے ، جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا ، دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار سمجھا - لفظ صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہر پناہ کے اندر کی زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا - صرف سروقدان دہلی سے کام رکھا ، باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رہنے دیا - البتہ دوسرے گلشن سدا بہار سے خاص خاص رنگ کے پھول چنے اور ان کے گل دستے بنائے ، مگر پھر بھی چمنستان سخن کے صدہا خوش نما پھول گل چیں کی مہربانی یا تغافل (جو چاہو اس کا نام رکھ لو) کی بدولت اپنی شاخوں پر پژمردہ ہو کر رہ گئے -"

دیباچے کے صفحہ ے پر لالہ سری رام لکھتے ہیں :

"جن جن تذکروں سے ہم نے مدد لی ان کے نام ناسی ذیل میں درج ہیں :

گلستان سخن ، گلشن بے خار ، نغمۂ عندلیب ، انتخاب یادگار ، سخن شعراء ، سراپا سخن ، آب حیات ، شمیم سخن ، تذکرہ شعرائے دکن ، طبقات الشعرائے شوق ، تذکرۂ قاسم ، تذکرۂ مصحفی ، تذکرۂ منو لال ، شمع سخن [انجمن ؟] ، مجموعۂ یوسفی ،

ریاض فردوس ، تذکرہ نواب کلب حسین نادر ، طور کلیم ، طراز عشق ، غنچۂ ارم ، تذکرۂ شبستان عالم گیری ، آثار الشعراء ، چمنستان کشمیر ، مجموعۂ سخن ، تذکرہ شعرائے پٹنہ ، تذکرہ لطف ، جلوۂ خضر ، نکات الشعراء ، فرح بخش ، طبقات الشعراء (جسے ڈاکٹر فیلن صاحب نے فرنچ زبان سے گارّی سن ڈی ٹیسی کے تذکرے سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مولوی کریم الدین نے اس میں اپنے وقت کے شعراء کو بڑھا کر قبل از غدر چھاپا) ، تذکرۂ شعرائے ہنود ، تذکرۂ شعرائے بدایوں ، تذکرۂ شرائے ٹونک ، تذکرۂ ضیغم ، تذکرۂ مولوی مظہرالحق ، غرض :

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم"

قاضی عبدالودود صاحب نے بھی گلستان سخن کے بارے میں دو جگہ تفصیلی رائے کا اظہار کیا ہے - رسالہ 'معاصر' پٹنہ کے حصۂ اول صفحہ ۷ پر فرماتے ہیں :

" گلستان سخن جس کا ایک نام آثار المعاصرین بھی ہے ، شعبان ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ میں تمام اور اسی سال طبع ہوا - سرورق میں قادر بخش صابر کا نام بہ حیثیت مصنف درج ہے ، لیکن اس کے بعد ہی یہ مرقوم ہے کہ اس کی عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں - غالب ۸۲ھ کے ایک خط میں ذکاء کو لکھتے ہیں " آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں ... غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا - اب ایک مجلد کہیں نظر نہیں آتا ... " (اردوئے معلیٰ ، ص ۲۸) لیکن ایک قدیم تر خط میں شفق کو لکھ چکے ہیں کہ صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں (ص ۳۳۱) - تساخ اور سری رام اسے صہبائی کی تصنیف بتاتے ہیں اور قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ غالب کے قول پر مبنی نہیں - میرا خیال ہے کہ مقدمے کے مطالب علمی اور تذکرے کی عبارت صہبائی کی ہے اور شعراء کے حالات اور اشعار دونوں نے جمع کیے ہیں -

اس لیے اگر اسے دونوں کی مشترک تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ مقدمے میں (ص ٦٧) جن شعراء کا خاص طور پر ذکر ہے وہ احسان ، نصیر ، مومن ، ذوق ، غالب ، شیفتہ ، نیر ، سوز ، صہبائی اور ان سے الگ آزردہ کا ذکر ہے .. ۱"

اسی مجلے کے صفحہ ۹۲ پر گلستان سخن کی تلخیص درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :

"۱ ۔ دیباچہ دستور فصاحت [امتیاز علی عرشی] میں ہے کچھ لوگوں یہ بھی خیال ہے کہ اصل تذکرے (گلستان سخن) کے مصنف صہبائی ہیں ۔ اس قسم کی رائیں حسن ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں ، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں (ص ۱۰۳) ۔ اگر دستاویزی شہادت سے صابر یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو یہ واقعی موجود نہیں ، لیکن غالب۲ گلستان سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے اور نساخ سخن شعراء صفحہ ۲۷۲ اور سری رام دیباچہ خم خانۂ جاوید ، جلد ۲ کی بھی یہی رائے ہے کہ صہبائی اور صابر کا بزرگان سلف میں ہونا خارج از بحث ہے ۔ غالب صہبائی کے ہم عصر ہیں ، لیکن باوجود اس کے کہ لطائف غیبی میں غالب کی ستائش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ، اس کا لفظ لفظ غالب کے قلم سے ہے اور سیاح کو ، جن کی طرف یہ منسوب ہے ، اس سے مطلق سروکار نہیں ۔ میرے نزدیک شعراء کے حالات و اشعار بیشتر صابر

---

۱ ۔ اقتباس از 'جہان غالب' مؤلفہ قاضی عبدالودود مشمولہ معاصر حصہ ۳ ، پٹنہ ص ۷ ۔

۲ ۔ غالب نے شفق کو ایک کتاب بھیجی ہے جسے صہبائی کا تذکرہ کہا ہے ۔ یقین کامل ہے کہ اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے (خطوط غالب ص ۳۳۱) اس برخلاف انھوں نے ذکاء کو لکھا ہے کہ آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں ۔ غدر سے پہلے چھپا تھا ، اس کے نسخے ضائع ہوگئے ، کہیں نظر نہیں آتا ۔ یہ تضاد حقیقی نہیں کہ ذکاء نے صابر کا تذکرہ مانگا ہوگا ۔ غالب نے وہی لکھ دیا جو ذکاء نے لکھا تھا ۔

اور کم تر صہبائی کے فراہم کردہ ہیں ، لیکن عبارت سراسر صہبائی کی لکھی ہوئی ہے اور مقدمے کے علمی مباحث کے وہ تنہا ذمہ دار ہیں ؛ لیکن گلستان سخن سے قطع نظر صابر کی ایک سطر بھی موجود نہیں جسے ان کے ذی علم ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے - یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ بات کہ عبارت میں صہبائی کی اصلاح ہے ، بار بار لکھی گئی ہے اور خلاف دستور سرورق میں بھی اس کا ذکر ہے - میرا خیال ہے کہ صہبائی کے دہلوی معاصرین اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کتاب دراصل صہبائی کی ہے اور کھلا راز نساخ کو اپنے زمانۂ قیام دہلی میں انھیں سے معلوم ہوا - میرا قیاس ہے کہ سری رام نے بھی یہ بات بہ طور روایت سنی اور ان کا بیان غالب کے قول پر مبنی نہیں -۱"

'تذکروں کا تذکرہ نمبر' کے مرتب فرمان فتح پوری قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کو درست تسلیم نہیں کرتے - اس سلسلے میں وہ گلستان سخن کے تحت فرماتے ہیں :

> "حیرت ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب بھی اس باب میں بعض باتیں غیر ذمہ دارانہ کہہ گئے ہیں ؛ مثلاً محمد محفوظ الحق صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ گلستان سخن کے متعلق دہلی کے معتبر اصحاب کا بیان ہے کہ یہ دراصل صہبائی کی تالیف ہے . . . یہ غلط ہے - گلستان سخن صہبائی کا نہیں ، قادر بخش صابر ہی کی تصنیف ہے -"

معاصر شہادتوں کی موجودگی میں فرمان فتح پوری کی رائے قابل تسلیم نہیں - گلستان سخن کے ابتدائی ۲۰۳ صفحات میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ صہبائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا - صہبائی کی اپنی تحریریں موجود ہیں اس لیے یہ بحث محض دلائل کی حد سے گزر کر واقعات اور عبارات کی مدد سے طے کی جاسکتی ہے -

(۲)

صابر نے جہاں اور کئی ماخذوں کا حوالہ دیا ہے ، وہاں بعض

---

۱ - ص ۹۲ - ۹۳ -

مقامات پر خود صہبائی کی تحریروں سے بھی استناد کیا ہے ۔ اس سے قطع نظر ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا :

۱ ۔ ہمارے پاس مطبوعہ صورت میں صہبائی کی کئی فارسی تحریریں موجود ہیں ، لیکن اگر بحث کو صرف اردو کتابوں تک محدود کردیا جائے جب بھی بحث کچھ نہ کچھ واضح نتائج پیدا کرسکتی ہے ۔ گلستان سخن کی تالیف سے پہلے صہبائی دو کتابیں لکھ چکے تھے ۔ دہلی کالج کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے پرنسپل بوترس کی فرمائش سے میر شمس الدین فقیر کی کتاب 'حدائق البلاغت' کا اردو ترجمہ (۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ع) کیا تھا ۔ یہ کتاب فقیر کی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر اختصار اور تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور مثالیں بھی فارسی کی بجائے اردو کی دی گئی ہیں ۔ اسی طرح پرنسپل موصوف ہی کی فرمائش پر انھوں نے ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ع میں 'انتخاب دواوین شعرائے مشہور اردو زبان کا، کے نام سے ولی سے لے کر معاصرین تک چیدہ چیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا ، ہر شاعر کے مختصر حالات دینے کے علاوہ ابتداء میں اصناف سخن پر تیس صفحات کا دیباچہ بھی لکھا ۔ صہبائی کی یہ دونوں تحریریں گلستان سخن سے پہلے چھپ چکی تھیں ۔ ذیل میں تذکرے کی بعض عبارتیں ان دونوں کتابوں کے بعض ضروری اقتباسات کے محاذ میں درج کی جاتی ہیں ۔ ان سے معلوم ہوگا کہ گلستان سخن کے ابتدائی حصے کی تالیف کے وقت یہی دو کتابیں پیش نظر تھیں ۔ ان کے نفس مضمون اور اسلوب بیان میں اور گلستان سخن کے ابتدائی حصے میں ایک نسبت قریبہ پائی جاتی ہے :

انتخاب دواوین	گلستان سخن
... معلوم کیا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں اور اصطلاح شعراء میں ایک کلام ہے کہ وزن اور قافیہ رکھتا ہو اور شاعر نے اس کو شعر کے قصد سے کہا ہو ۔ پس اگر ایک کلمہ ہو یا	پہلا مطلب حد شعر : جاننا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں ، یعنی دانستن اور اصطلاح میں کلام موزون مقفیٰ کو ۔ جو کہ شعر کی تعریف کے تین جز ہیں کلام اور موزوں اور مقفیٰ ۔ کلام اور

زیادہ ہو ، یا کوئی وزن اوزان مقررہ میں سے قافیہ نہ رکھتا ہو یا شاعر نے اوس کو شعر کے قصد پر نہ کہا ہو، موافق اصطلاح کے وہ شعر نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ردیف شعر کی ماہیت میں داخل نہیں ۔ پس شعر بدون قافیے کے تمام نہیں ہو سکتا ہے اور بدون ردیف کے تمام ہو سکتا ہے اور یہ مذہب ہے جمہور کا ۔ اسی واسطے بہت اشعار میں ردیف نہیں ہوتی ۔ چنانچہ یہ شعر سودا کا :

اگر عدم سے ہو نہ ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانہ کو لے کر نہو گہر پیدا

کہ 'کا' اور 'پیدا' قافیہ ہے اور اس کے بعد ردیف نہیں ہے ۔ (ص ۲۱)

وزن اور قافیے کے معنی کا بیان واجب ہوا تا کہ تعریف کا ینبغی دل نشین اور خاطر سامع میں جاگزین ہو جاوے ۔ اس واسطے لکھا جاتا ہے کہ کلام علم نحو کی اصطلاح میں ان دو کلمے یا زیادہ کا نام ہے کہ اسناد رکھتے ہوں ، یعنی ایسی نسبت کہ مخاطب کو بعد سکوت قائل کے فائدہ تامہ حاصل ہو جاوے اور اس کو مرکب مفید بھی کہتے ہیں ، جیسے زید قائم ہے ؛ لیکن تعریف مذکور میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ کلام سے مطلق الفاظ با معنی مراد ہیں ، اسناد پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں ، اسی واسطے بعضے اس تعریف میں بجائے کلام کے الفاظ با معنی ایراد کرتے ہیں ، تا مرکب غیر مفید بھی ، بشرط وزن و قافیہ ، شعر کی تعریف میں داخل رہے ۔ جیسے یہ شعر :

وہ شوخ ستم کیش کہ اغوائے عدو ہے
عاشق کی دم مرگ بھی بالیں پہ نہ آیا

(ص ۱۲۹)

پہلے جس شخص نے شعر وضع کیا ہے ، اس میں بہت اختلاف ہے ۔ بعضے کہتے ہیں اول شعر حضرت آدم نے کہا ہے ۔ چنانچہ دو تین شعر عربی کے کہ آن کی طرف

ذکر موجد اشعار : بعضے ارباب تواریخ لکھتے ہیں کہ ایجاد شعر کا حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام سے وقوع میں آیا ہے ۔ جس وقت قابیل نے ہابیل کو قتل کیا ، حضرت

منسوب ہیں ، ترجمہ ہیں ان اشعار کا جو ہابیل کے مرثیے میں کہے ہیں ، جب قابیل نے اوس کو قتل کیا تھا اور وہ سریانی زبان میں تھے اور کہتے ہیں کہ اول شعر عربی میں ایوب بن قحطان نے کہا اور فارسی میں بعضوں کے قول کے موافق بہرام گور اور بعضوں کے موافق ابو حفص حکیم سمرقندی نے اور بعض کہتے ہیں کہ اردو میں پہلے شعرگوئی ولی نے اختیار کی ہے ، لیکن یہ قول کہ حضرت آدم واضع شعر کے ہیں ، بشرط صحت کے البتہ ان سے پہلے اور کوئی شعر کہنے والا متحقق نہیں ہو سکتا ، و الا باقی شعراء جن کو واضع اشعار کا اور زبانوں میں قرار دیا جاتا ہے ، اس میں اختلاف ہے ؛ کیونکہ بعد تلاش کے ان سے پہلے بھی اور شاعر معلوم ہوئے ہیں ؛ چنانچہ کتابوں میں اس کا حال مفصل لکھا ہے اور ولی نے اپنے اشعار میں اور شعراء پر طنز کی ہے - (ص ۳۰۲)

بابرکت نے اس کے مرثیے میں چند شعر فرمائے جو کہ وہ اشعار عربی ہیں ، عبارات اردو میں ان کا ایراد مناسب معلوم نہ ہوا - وہ اشعار کثرت شہرت سے اس مقام کی تحریر سے مستغنی ہیں - (ص ۱۳۲)

معلوم کیا چاہیے کہ نظم باعتبار قافیہ اور وزن اور قلت اور کثرت مصرعوں کے کئی قسم ہو جاتا ہے اور کئی قسم علیحدہ ہو جانے میں اس نظم کے معنی کو بھی دخل ہوتا ہے - چنانچہ اس موقع پر اشارہ

معلوم کیا چاہیے کہ نظم کوئی قسم ہے - فرد ، رباعی ، غزل ، قصیدہ ، نسیب ، قطعہ ، مثنوی ، مسمط ، ترجیع ، مستزاد - ہر چند نسیب شعر کی قسم علیحدہ نہیں ہے بلکہ قصیدہ کا جزو ہے کہ باعتبار

کر دیا جائے گا - بہر کیف ان اعتبارات سے نظم کی یہ قسمیں ہیں: فرد ، غزل ، قصیدہ ، تشبیب ، قطعہ ، رباعی ، مثنوی ، ترجیع بند ، مسمط ، مستزاد اور واسوخت - (ص ۳)

ایک حیثیت کے باقی اشعار سے ممتاز ہے اور اسی طرح مستزاد کہ بعضے اصناف شعر مثل فرد اور رباعی اور غزل ایک صورت ِ خاص میں اس اسم کے ساتھ مسمیٰ ہو جاتے ہیں اور حال اس کا اپنے محل میں مشروحاً دریافت ہو جاوے گا - آسانی فہم اور مبتدیوں کی تفہیم کے واسطے اقسام میں داخل کر کے ہر ایک کا بیان علیحدہ کیا جاتا ہے:

فرد

دو مصرعے کے شعر کو کہتے ہیں مطلقاً - خواہ دونوں مصرعہ میں قافیہ ہو خواہ ایک میں اور اس کو بیت بھی کہتے ہیں ؛ لیکن ان دونوں ناموں میں اس قدر فرق ہے کہ شعر کے تنہا ہونے کی صورت میں فرد نام رکھا جاتا ہے اور بیت خواہ تنہا ہو ، خواہ منجملہ اور اشعار کے ، جیسے کہ ایک شعر غزل یا قصیدہ یا قطعہ کا ... پس فرد خاص ہے اور بیت عام - فرد بہ سبب تنہا ہونے کے کہتے ہیں اور بیت میں کئی قول ہیں ، سب کا لکھنا موجب تطویل کلام کا ہے - ان میں سے ایک وجہ قوی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیت گھر کو کہتے ہیں اور گھر عرب کے

فرد

ایک شعر کو کہتے ہیں کہ کوئی اور شعر اس کے ہم راہ نہ ہو ، خواہ دونوں مصرعے مقفیٰ ہوں ، خواہ مصرع آخر - مثال اس کی ظاہر ہے -

صحرا نشینوں کا اکثر کنبل کا ہوتا ہے ، جس کو پال کہتے ہیں اور وہ میخ اور رسی اور ستون سے مرکب ہوتا ہے اور بیت بھی وتد اور سبب اور فاصلہ سے مرکب ہوتا ہے اور وتد میخ اور سبب رسی اور فاصلہ ستون کو کہتے ہیں اور ان اجزاء کا حال علم عروض میں مفصل لکھا ہوا ہے - پس بیت یا فرد ہونے میں فقط مصرعوں کی قلت کو دخل ہوا ، نہ وزن اور قافیے کو -

[رباعی]

رباعی دو بیت ہیں کہ مصرع[٭] اول اور دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوتا ہے اور کبھی چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں - اس کو چار مصراعی [اور] دو بیتی بھی کہتے ہیں اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن مقرر ہیں - اگر وہ چار مصرعے ان اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں گے ، پس اس کو رباعی کہیں گے و الا چار مصرع کو رباعی[کہنا درست نہیں ہے - جیسے کہ عادت عوام کی ہے کہ چار مصرعہ کہ ان میں سے پہلا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو ان کو رباعی کہہ دیتے ہیں اور تفصیل اوزان

رباعی

رباعی دو بیت کا نام ہے ، خواہ مصرع اول اور ثانی اور رابع ہم قافیہ ہوں ، خواہ چاروں مصرعے اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن خاص معین ہیں کہ ان کا بیان عروض میں ہو چکا ہے - اس نظم کی دو بیت پر بنا ہونے کی وجہ یوں لکھتے ہیں کہ جس وقت شاعر نے یہ وزن اختراع کیا اس وقت نہایت فرحت اور انبساط میں تھا اور زہرہ اور عطارد میں نظر تسدیس یا تثلیث اور آفتاب و مشتری میں نظر تثلیث تھی اور خاص و عام اس وزن سے نہایت محظوظ تھے - اس نے اس نظم میں دو بیت پر اختصار کیا کہ

رباعی کی حدائق البلاغت کے اردو ترجمہ میں موجود ہے ، اس میں مطالعہ کر لیں ۔ پھر کیف رباعیات اس منتخب میں ان اوزان میں سے اکثر وزن پر مرقوم ہیں ۔ ہر وقت مطالعہ کے معلوم ہو جائیں گی ۔ (ص ۷)

طول سخن سامع میں ملال پیدا نہ کرے ۔

غزل

غزل لغت میں عورتوں کی باتیں اور عورتوں کے عشق کی باتیں کرنے کو اور اس سخن کو بھی کہتے ہیں جو عورتوں کی تعریف میں کہا جاوے اور اصطلاح میں کئی بیتوں کا نام ہے کہ سب کا وزن ایک ہو اور پہلے بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیے ہوں اور باقی ابیات کے دوسرے مصرعے ۔ پہلے بیت کو مطلع کہتے ہیں اور دوسرے بیت کو جو مطلع کے بعد ہے حسن مطلع اور بیت آخر کو مقطع اور شعرائے متاخر قاطبۃً اپنا نام جس کو تخلص کہتے ہیں مقطع میں داخل کرتے ہیں اور شعرائے مقدم اس امر کے مقید نہ تھے ۔ معلوم کیا چاہیے کہ عرب میں مرد کا عشق عورتوں پر ہوتا ہے اور فارس میں مرد کا عشق غالباً اطفال پر اور کبھی عورت پر بھی اور

غزل و قصیدہ

غزل ایسے چند بیت متحدالوزن کو کہتے ہیں کہ بیت اول کے دونوں مصرع کا قافیہ باقی ابیات کے مصرع اخیر کے قوافی کے ساتھ متحد ہو ۔ بیت اول کو مطلع کہتے ہیں اور یہی تعریف ہے قصیدے کی ، لیکن فاصل اور فارق ان دونوں میں یہ ہے کہ غزل بارہ تیرہ سے بیت متجاوز نہیں ہوتی اور قصیدے کے واسطے نہایت نہیں ۔ مگر غالباً ڈیڑھ سو بیت سے زیادہ نہیں کہتے اور اس زمانے میں غزل بیس پچیس بیت تک بھی کہتے ہیں اور غزل و قصیدہ میں اس طرح سے فرق کرتے ہیں کہ اگر مضمون ہر بیت کا مختلف یا عاشقانہ ہو تو اس کو غزل جانتے ہیں اور اگر مدحت یا نصائح اور مثل ان کے ہو تو قصیدہ اور متاخرین غزل میں تخلص یعنی نام شاعر کا مقطع میں اور قصیدے میں

فارسیوں کے اتباع سے اردوگو بھی یہی رویہ برتتے ہیں ، اگرچہ ہند میں عورت کا عشق مرد پر شائع ہے اور یہ امر کبت اور دو دوڑہوں سے ظاہر ہے اور از بس کہ عربی غزلوں میں حدیث عورتوں کی ہوتی ہے ، اسی واسطے اس کا نام غزل رکھا اور فارسی اور اردو گویوں نے بھی ان ابیات مخصوصہ پر وہی نام مسلم رکھا ، لیکن غالباً غزل مضامین عشقیہ سے خالی نہیں ہوتی ۔ لیکن بعد مرور ازمنہ کے غزل میں پند اور نصائح اور معرفت کے مضامین یا تعریف شراب کی بھی باندھنے لگے اور غزل کے ہر بیت کا مضمون علیحدہ ہوتا ہے یعنی اگر ایک بیت میں ہجر کا بیان ہے تو دوسرے میں وصل کا ہوتا ہے یا اگر ایک میں اپنا فخر ہے ، دوسرے میں اپنا عجز بیان ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ مثلاً اگر اول سے ہجر کا بیان شروع کیا ہے ، مقطع تک اسی کا ذکر چلا جاوے اور شعراء فارس متاخر نے غزل میں ایک طرز نئی ایجاد کی ہے اور وہ یہ ہے کہ معشوق کو کسی اور کا عاشق قرار دے کر اس کے سوز و گداز کے مضامین غزل میں باندھتے ہیں اور اردو غزل گویوں جس بیت میں چاہتے ہیں ذکر کرتے ہیں اور قدماء غزل میں بھی نام کو مقطع کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے اور بہتر یہ ہے کہ مضمون غزل عاشقانہ ہو تاکہ غزل کی مناسبت باقی رہے ؛ کس واسطے کہ غزل لغت میں عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور قصیدہ مغز غلیظ کو کہتے ہیں ۔ جو کہ عادت قدماء کی یہ تھی کہ قصیدے میں الفاظ متین ، جو ممدوح کے تحشم اور علو شان پر دلالت کریں ، استعمال کرتے تھے ، اس نام کے ساتھ موسوم کیا ۔

نے بھی ان کے اتباع سے اس طرح
کی غزل طرح کیں - چنانچہ سودا
کی غزل جس کا مطلع یہ ہے :

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

ارو باقی ابیات دیوان کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہیں - بہرکیف غزل کی بیتوں کی حد میں اختلاف ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ گیارہ بارہ بیت سے زیادہ نہ چاہیے ؛ کس واسطے کہ کثرت اشعار کی قصیدہ کے واسطے مناسب اور زیبا ہے - (ص ۴، ۵)

مثنوی

ایسی بیتیں ہیں کہ وزن سب کا ایک اور قافیہ دو دو مصرعہ کا متفق اور ہر بیت قافیہ جدا گانہ رکھتی ہے - حد مثنوی کی معین نہیں - جیسے اردو میں مثنوی میر حسن کی جس میں بدر منیر اور بے نظیر کا قصہ مسطور اور تمام عالم میں مثل بدر منیر کے مشہور ہے - (ص ۷)

مثنوی

وہ ابیات ہیں کہ وزن سب کا متحد اور قافیہ علیحدہ ہو، لیکن ہر بیت کے دونوں مصرعے قافیہ رکھتے ہوں - چند بیتِ مثنوی میر سے بہ طریق نمونے کے مرقوم ہیں -

مسمط

لغت میں سوتی کی لڑی کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس طرح کی نظم کو کہتے ہیں کہ اول چند

مسمط

وہ چند مصرعے ہیں کہ وزن و قافیہ میں متفق ہیں، ہمراہ ایسے ایک مصرعے کے کہ وزن میں ان

مصرعہ قافیہ میں متفق ہوں اور بعد اس کے اسی قدر مصرع اور اس طرح کے ہوں کہ قافیہ مصرعِ اخیر کا موافق ان چند مصرع کے ہو اور باقی مصرع کا ان سے مخالف ، اسی طرح پر جس قدر چاہیں کہیں ، اس کے خانوں کی حد معین نہیں ۔ پس اگر ہر خانہ تین تین مصرعہ کا ہو تو اس کو مثلث کہتے ہیں اور اگر چار مصرع کا اس کو مربع اور اگر پانچ مصرعہ کا اس کو مخمس اور اگر چھ مصرعہ کا اس کو مسدس اور اگر سات مصرع کا اس کو مسبع اور اگر آٹھ مصرعوں کا اس کو مثمن اور اگر نو کا اس کو متسع اور دس کا اس کو معشر کہتے ہیں اور حد مصرعوں کی دس تک ہے ۔ اردو گو مخمس اور مسدس بیشتر کہتے ہیں اور باقی اصناف کم اور بعضوں نے مثلث بھی کہے ہیں ۔ (ص ۱۰-۱۱)

مصارع سے موافق اور قافیے میں مخالف ہوتا ہے ۔ اور گاہ گاہ یہ مصرع بھی ان مصارع کے ساتھ قافیے میں اتحاد رکھتا ہے ۔ اور یہ امر اس مسمط کے پہلے بند سے ظاہر ہے کہ اس کے چند مصرعے مطلع غزل کے ساتھ الحاق کیے جاویں ۔ مصنف مناظر الانشاہ لکھتا ہے کہ مولانا وحید تبریزی کے رسالے میں کہ عروض اور قافیہ اور بدیع پر مشتمل ہے ، مرقوم ہے کہ مسمط چار مصرع سے دس مصرع تک ہوتا ہے ۔ پس یہ تعریف مربع اور مخمس اور مسدس اور مسبع اور مثمن اور متسع اور معشر کو شامل ہے (یہاں تک کلام اس کا منتہی ہوا) ؛ لیکن مثلث بھی پایا جاتا ہے اور جاننا چاہیے کہ جب ابیات مسمط کے مکرر ہو جاویں تو چاہیے کہ آخیر مصرعے قافیے میں متحد ہوں ۔ مثلث اور مربع اور مخمس کی مثال مرقوم ہوتی ہے کہ کثیرالوجود ہے اور باقی اشعار کم پائے جاتے ہیں ۔

(ص ۱۷۶ تا ۱۷۸)

ترجیع

لغت میں ترجیع بہ معنی الٹنے اور پھرنے کے ہیں اور اصطلاح میں وہ

ترجیع بند

مصنف 'مناظرہ الانشاء' نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ترجیع

چند شعر ہیں کہ خانہ خانہ ہوویں اور ہر خانہ ایک غزل کے برابر ہو۔ قافیہ اس خانہ کا بعینہ مانند قافیہ غزل کے، یعنی مطلع کے دونوں مصرع اور باقی ابیات کے بھی مصرع ہم قافیہ ہوں اور قافیہ ایک خانہ کا دوسرے خانہ کے قافیہ سے مخالف ہوں اور تمام ہونے کے بعد ایک اجنبی بیت لاویں اور چاہیے کہ وہ بیت اجنبی بہ اعتبار معنی کے پہلے بیتوں سے ربط رکھتی ہو۔ پس اگر بند کی بیت بار بار بعینہ مکرر ہو، اس کو ترجیع بند کہتے ہیں اور اگر مختلف ہو ترکیب بند۔ اور ترکیب بند دو طرح ہے ; ایک یہ کہ بند کے ہر بیت کا قافیہ علیحدہ ہو؛ چنانچہ اگر جمع ہوویں مثنوی ہو جاوے اور دوسرے یہ کہ سب بیتیں ایک قافیہ پر ہوں؛ چنانچہ اگر جمع ہوں سب مل کر ایک خانہ ہو جاویں۔ (ص ۱۰)

وہ شعر ہے کہ حصہ کیا جاوے ایسی بیت کے ساتھ کہ اس کے ہر مصرعے میں قافیہ ہو اور ہر حصہ اس کا چند بیت صاحب مطلع ہوتے ہیں کہ وزن اور قافیے میں اتحاد رکھتے ہوں۔ اس حصہ کرنے والی بیت کو بند ترجیع کہتے ہیں اور وہ بند غالباً ہر جگہ ایک ہی بیت ہوتی ہے، اور گاہ گاہ غیر اول کی اور بند چاہیے کہ ابیات سابق سے بااعتبار معنی کے مرتبط ہو۔ اور شمس فخری معیار جمالی میں لکھتا ہے کہ ترجیع کئی قسم ہے؛ اول یہ کہ شاعر پانچ یا سات یا نو یا گیارہ بیتیں جس وزن اور قافیہ اور ردیف میں چاہے کہے اور بعد ان کے ایک اور بیت لاوے کہ اس قافیہ اور ردیف پر نہ ہو، اور پھر اسی قدر بیتیں کہ پہلے کہیں تھیں، کہہ کر ایک اور بیت لاوے اس طرح آخیر تک تمام کو پہنچاوے۔ ان ابیات کو خانہ اور اس بیت کو بند کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعد ہر خانہ کی ابیات کے بند آئے ہوں کہ قافیہ اور ردیف میں اتحاد رکھتے ہوں؛ اگر ابیات بند کو جمع کریں ایک قطعہ ہو جاوے، تیسرے یہ کہ بند ہر جگہ ایک ہی بیت ہو۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ سب خانوں کی ردیف ایک اور قافیہ مختلف ہو یا بالعکس (یہاں تک شمس فخری کا کلام تمام ہوا) ۔ مؤلف کہتا ہے کہ صاحب 'مناظر الانشاء' کے لکھنے سے کہ بند گاہ گاہ غیر مکرر ہوتا ہے اور اقسام اربعہ مذکورہ کی پہلی اور تیسری قسم کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ ترتیب بند بھی ترجیع کی ایک قسم ہے ۔ اور ماہران فن پر واضح ہے کہ ترکیب بند اُنھیں اشعار کو کہتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت پر ہو ، اور شمس فخری کے اس قول سے کہ اگر ان ابیات کو جمع کریں تو ایک قطع ہو جاوے، معلوم ہوتا ہے کہ بند کے دوسرے ہی مصرع میں قافیہ ہو ، نہ یہ کہ پہلا بند بشکل مطلع کے اور باقی ابیات ، ابیات غزل کے طور پر ۔ اور شعرائے قدیم و حال کا مشاہدہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے ۔ اور دو بیت پر بھی خانہ کی بنا رکھتے ہیں ۔ اس روزگار میں یہ اشعار مسدس کے نام سے مشہور ہیں ۔ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۱)

مستزاد

ایسی نظم کو کہتے ہیں کہ بعد ہر مصرع یا بیت کے ایک فقرہ نثر

مستزاد

مستزاد ایسا کلام منظوم ہے کہ اس کے مصرع یا بیت کے بعد اس

کا زیادہ کر لیں لیکن بہ شرطیکہ وہ فقرہ اس نظم سے بہ اعتبار معنی کے مربوط ہو اور وہ نظم بغیر اس فقرہ کے بھی تمام ہو سکتا ہو، یعنی اگر وہ فقرہ نہ ہو تب بھی معنی درست ہوں اور اس فقرہ پر نثر کا اطلاق اس واسطے ہے کہ اگرچہ وہ بھی کسی ایک دو رکن کے وزن پر ہے، لیکن وزن تمام مصرع کا نہیں ہے -

طرح سے ایک پارہ کلام زیادہ کیا جائے کہ بہ حسب معنی اس نظم سے مرتبط ہو - مگر جاننا چاہیے کہ مستزاد رباعی اور غزل وغیرہ کے مقابل نہیں ہے بلکہ رباعی وغیرہ کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے، یعنی رباعی و غزل مستزاد ہوتی ہیں اور اگر مقابل ہوتے تو ان دونوں کا جمع ہونا محال تھا اور یہ امر کہ وہ پارۂ کلام جو زیادہ کیا جاتا ہے، نثر ہے یا نظم ؟ ایک بحث دور و دراز رکھتا ہے - اس کی تفصیل استاذی و مولائی جناب مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کے رسالۂ قافیہ سے جس کا نام 'وافی' ہے، دریافت کریں کہ اس سے بہتر کسی کتاب میں مرقوم نہیں ہے - ملخص کلام یہ ہے کہ وہ پارہ بھی نظم ہے نہ نثر؛ جیسے کہ بعضوں کا گمان ہے -
(ص ۱۹۳)

[نسیب]

(جہاں شاعر قصیدے میں چند شعر کے بعد مدح کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ان اشعار کو تشبیب کہتے ہیں - تفعیل کے وزن پر اور اس کا نام نسیب بھی ہے - سین بے نقطہ سے فعیل پر - نسیب کے معنی ایام جوانی کا ذکر کرنا اور نسیب

نسیب

چند بیت کا نام ہے کہ قصیدے میں مقصد سے پہلے بہ طور تمہید کے مذکور کریں اور جو کہ ان ابیات اور اشعار مدح وغیرہ میں کوئی واسطہ چاہیے، بعد ان ابیات کے ایسے ایک دو بیت ہوتے ہیں کہ مقصد کی طرف متوجہ ہونے پر

عورتوں کا ذکر کرنا ۔ اس نام سے معلوم ہوا کہ اول یہی اسم تھا کہ قبل از مقصود اشعار عاشقانہ لکھتے تھے ، لیکن اب خصوصیت ایسے اشعار کی نہیں رہی بلکہ مقصود سے پہلے جس قسم کے شعر ہوں ان کو تسبیب کہیں گے اور جس قصیدہ میں تشبیب نہ ہو یعنی اول سے مدح یا ہجو مثلاً شروع کریں اس کو مجنو کہتے ہیں اور جس میں تخلص یعنی گریز نہ ہو مقتضب کہتے (ہیں) ۔ (ص ۲)

دلالت کرتے ہیں ؛ ان بیتوں کو عربی میں تخلص اور فارسی میں گریز گاہ کہتے ہیں ۔ نسیب کو تشبیب بھی کہتے ہیں اور جو کہ نسیب لغت میں عورتوں کی باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور تشبیب ذکر ایام شباب کو ، غالباً اوائل حال میں یہ بیتیں صرف عاشقانہ ہوتی ہوں گی ، پھر رفتہ رفتہ اور مضامین مثل شکایت روزگار یا فخریہ وغیرہ پر بھی مشتمل ہونے لگیں ۔ راقم غزل و قصیدے کی مثال پر قناعت کر کے سودا کے اس قصیدے سے جو بسنت خاں کی مدح میں لکھتا ہے ۔

(ص ۱۷۲ تا ۱۷۵)

قطعہ

لغت میں کسی چیز کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ان چند بیت کا نام ہے کہ وزن اور قافیہ میں متحد ہوں ، مثل غزل کے ، لیکن مطلع نہ ہو ۔ کس واسطے کہ اگر مطلع ہوگا ، پس دو حال سے خالی نہیں ؛ یا بیتیں اس کی غزل کی حد سے متجاوز ہوں گی یا نہ ہوں گی ۔ پہلی صورت میں قصیدہ ہے اور دوسری صورت میں غزل

قطعہ

ابیات متحدۃ الوزن و القافیہ میں بدون مطلع کے ۔ پس اگر مطلع ہو اور ابیات قصیدہ سے کم ہو تو غزل و الّا قصیدہ ۔

اور اغلب قطعہ میں مضمون ابیات
کا ایک دوسرے سے علاقہ رکھتا
ہے .. اور کبھی ساری غزل یا
اس کے اکثر شعر ایک دوسرے
سے متعلق ہوتے ہیں ۔ اسی غزل
کو غزل قطعہ بند کہتے ہیں ۔
(ص ۷)

'انتخاب دواوین' کے یہ اقتباسات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ گلستان سخن میں انتخاب دواوین کے صفحات معمولی رد و بدل کے ساتھ شامل ہیں ۔ سوائے اس کے کہ کہیں کہیں اجمال کی تفصیل کر دی گئی ہے ۔

بعض دیگر مطالب اسی طرح 'حدائق البلاغت' کے اردو ترجمے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :

حدائق البلاغت (اردو ترجمہ)	گلستان سخن
معلوم کیا چاہیے کہ خلیل ابن احمد اس فن کا اوستاد اور جمع کرنے والا ہے ۔ اس نے کلام عرب میں تجسس اور تلاش کر کے معلوم کیا کہ اشعار عرب پندرہ بحر میں موزوں ہوتے ہیں ... اور بعد اس کے کہ ابو الحسن اخفش نے سولھویں اور ایجاد کی اور اس کا نام متدارک رکھا ... بہر کیف یہ سب انیس بحر ہوئے ۔ معلوم کیا چاہیے کہ ان بحروں میں سے بعض ایک رکن کے تکرار سے حاصل ہوئی ہیں اور بعض دو رکن کی ترکیب سے ۔	پوشیدہ نہ رہے کہ خلیل ابن احمد جب اوزان عرب میں تجسس کافی اور تفحص شافی عمل میں لایا ، اوزان شعر کے ضبط کے واسطے پندرہ بحر مرکب کیں اور جو جو بحر کہ انفکاک میں مشترک تھیں ان کو ایک ایک دائرے میں رکھا ۔ جو کہ بحر متقارب کے ساتھ کوئی بحر شریک نہ تھی ، اس کو ایک دائرے میں رکھ کر اس دائرے کا نام مفردہ مقرر کیا ۔ ابوالحسن اخفش نے جب اس میں نظر کی فعولن کے سبب کو وتد سے

جو بحر کہ ایک رکن کی تکرار سے حاصل ہوئی ہیں یہ ہیں ... جو دو رکن کی ترکیب سے حاصل ہوتی ہیں وہ یہ ہیں ... [یہاں بحور کی تفصیل دی ہے جو گلستان سخن کے صفحہ ۱۴۳ کے عین مطابق ہے] اصل بحر جدید کی فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن ہے دو بار - اس بحر کو قریب بھی کہتے ہیں اور اس بحر کو بوزرجمہر نے نکالا ہے اور اصل قریب کی مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن ہے دو بار - کہتے ہیں کہ مولانا یوسف نیشا پوری نے یہ بحر نکالی ہے اور وہ یہ شخص ہے کہ فارسی علم عروض پہلے اسی شخص نے تصنیف کیا ہے اور یہ شخص خلیل ابن احمد سے دو سو برس کے بعد پیدا ہوا ہے - الخ
(ص ۱۱۹ تا ۱۲۰)

مقدم رکھ کر بحر متدارک کو حاصل کیا اور متقارب کے ساتھ دائرے میں رکھ دیا اور شمس فخری نے 'معیار جمالی' میں لکھا ہے کہ اس بحر کو ماہران علم عروض نے خلیل ابن احمد کے دو سو برس کے بعد استخراج کیا - جدید کو بوزرجمہر اور قریب کو مولانا یوسف عروضی نیشاپوری نے پایا اور مولانا اوزان فارسی میں خلیل ابن احمد سے پایہ کم نہیں رکھتا- الخ (۱۳۵ ، جلد اول)

فصل ، ردیف کے بیان میں

ردیف وہ لفظ ہے کہ بعد قافیہ کے واقع ہو- خواہ کلمہ ہو، خواہ زیادہ - اکثر اس بات پر ہیں کہ ردیف سب جائے میں متحد المعنی چاہیے اور بعضے یہ کہتے ہیں کہ

ردیف وہ کلمہ مستقل ہے کہ بعد قافیے کے مذکور ہو - خواہ متحدالمعنی خواہ مختلف‌المعنی؛ قسم اول جیسے لفظ نہ تھا اس شعر میں :

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

اور دوسری قسم جیسے اس شعر میں :

رہنے نہ اگر غیر دیتے تمہیں باہم
اس طرح سے ہوتے نہ کبھی تم سے جدا ہم

اگر ردیف بہ اعتبار معنی کے مختلف ہو تو مضائقہ نہیں اور یہ اس حق ہے (ص ۱۸۹)

قافیہ 'با' اور 'جدا' ہے اور ردیف 'ہم' لیکن مصرع اول میں بہ معنی یک دگر ہے اور دوسرے میں ضمیر متکلم اور کبھی ردیف لفظ غیر مستقل بھی ہوتی ہے جیسے قافیہ معمول میں ۔ اس کی مثال کی کچھ حاجت نہیں ۔ (ص ۱۷۰)

فصل عیوب قافیہ کے بیان میں

عیب قافیہ کے کئی طرح پر ہیں، ایک ان میں یہ ہے کہ ایک جائے میں روی حرف اصلی ہو، دوسری جائے میں حرف زائد کو بہ تکلف روی کر لیا ہو؛ مثلاً گالی لالی کی کی یائے تحتانی گالی کی اصلی ہے اور لالی کی زائد ہے اور اس قبیل سے یہ شعر بھی ہے ... (اس کے بعد عیوب قوافی مع ناموں کے گنائے ہیں) الخ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۳)

جاننا چاہیے کہ ہر چند عیوب قافیہ کے، جن سے شاعران نازک کلام کو احتراز چاہیے، بہت ہیں، لیکن از بس کہ راقم اوراق کی نظر اختصار پر ہے، عیوب مشہورہ پر اکتفا کرتا ہے ۔ وہ عیوب یہ ہیں: اقوا، اکفا، سناد، ایطا، معمول ۔ ان عیوب کا بیان یہ ہے کہ اقوا حذو اور توجیہہ کے اختلاف کو کہتے ہیں ۔ حذو کا اختلاف کئی طرح ہے ؛ ایک یہ ہے کہ ہر جگہ حرکت ردیف کی ہو، لیکن جداگانہ ---- الخ (ص ۱۶۷ تا ۱۶۸)

رباعی

رباعی کا وزن مختص بحر ہزج کے ساتھ ہے اور اس میں نو زحاف آتے ہیں اور بہ سبب ان زحافوں کے چوبیس وزن حاصل ہوتے ہیں... اوزان رباعی کے یہ ہیں...'' الخ (ص ۱۶۷ تا ۱۷۲)

معلوم کیا چاہیے کہ رباعی کے اوزان ہزج مثمن سے ماخوذ ہیں اور وہ اوزان دس رکن سے ترکیب پاتے ہیں ۔ ایک ان میں سے سالم ہے یعنی مفاعیلن اور نو مزاحف اور وہ یہ ہیں ... ان ارکان ...'' الخ (ص ۱۶۰ تا ۱۶۱)

گلستان سخن اور حدائق البلاغت کا یہ اتحاد مطالب کئی مقامات پر حاوی ہے ۔ اختصار کی خاطر اقتباسات کے صرف چند نمونے دیے گئے ہیں ، ان میں کئی اور مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے ؛ مثلاً گلستان صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۴ اور حدائق البلاغت صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۷ اور صفحہ ۱۱۶ بعد ، صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۹ اور صفحہ ۱۲۷ بعد ؛ صفحہ ۱۶۲ کے شجرے اور صفحہ ۱۷۴ کے شجرے ؛ صفحہ ۱۶۳ اور صفحہ ۱۷۴ ؛ صفحہ ۱۶۶ اور صفحہ ۱۷۹ کا باہمی مقابلہ مذکورہ نتیجے کی تائید کرتا ہے[1] ۔

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا بے موقع نہیں کہ گلستان سخن کا یہ ابتدائی حصہ یا تو تمام تر صہبائی کی تحریر ہے یا اس کے ابتدائی خاکے کو استاد کے قلم نے یوں شکل و صورت دی ہے کہ یہ اسی کی شخصیت کا غماز ہو گیا ہے ۔

۲۔ صابر نے جیسا کہ خود اپنے تذکرے میں لکھا ہے (صفحہ ۱۷) ابتدا میں حافظ عبدالرحمان خان احسان سے تلمذ اختیار کیا ۔ مدت تک "افادہ و استفادہ کا ہنگامہ گرم" رہا اور "یہ صورت بہم پہنچی کہ ان کے اوقات بیشتر اصلاح تلامذہ میں مصروف ہونے لگے" اور "اپنے درد سر کو حضرت استاد کی تخفیف تصدیع کا باعث جانا ۔" اس سے "التفاف عام لطف خاص" میں بدل گیا اور استاد کی پوری توجہ معانی و بیان اور عروض و قوافی کے غوامض سکھانے میں بسر ہو گئی ، اور بہ قول صابر "ایک مدت تک نگاہ لطف میری ہی اصلاح میں ایک طرح سے مصروف رہی ۔" حافظ احسان کے انتقال کے بعد (جو بہ قول صفیر بلگرامی ۱۲۶۷ھ کا واقعہ ہے) شہزادہ صابر دو برس تک "اپنے ہی جوش میں موجزن رہے" اور حافظ

۱ ۔ گلستان کے صفحات مجلس ترقی ادب کے مطبوعہ متن کے حوالے سے ہیں اور حدائق البلاغت کا نسخہ مطبع سراجی دہلی کا ہے جس کے متن میں اصل فارسی کتاب اور حاشیے پر صہبائی کا اردو ترجمہ درج ہے ۔ اوپر جہاں کہیں حدائق کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے یہی اشاعت مقصود ہے ۔

احسان کے شاگرد بھی شہزادہ صابر سے اصلاح لینے لگے اور شہزادہ صابر کا نام "استادی کے ساتھ مشہور ہو گیا[1]۔"

بہر حال دو برس کے بعد انھیں مولوی امام بخش صہبائی سے رجوع کرنا پڑا اور وہ صہبائی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے ، گویا ۱۲۶۹ھ کے قریب انھوں نے صہبائی کی شاگردی اختیار کی ہوگی۔ گلستان سخن کا آغاز ۱۲۷۰ھ میں کیا گیا اور ۱۲۷۱ھ کو یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچا ؛ گویا مولانا امام بخش صہبائی سے استفادے کی مدت تذکرے کی تحریر تک بہ مشکل پندرہ مہینے ہوتی ہے۔ اتنے مختصر سے عرصے میں استاد کا اتنا اثر کہ شاگرد کی تحریر پختگی اور روانی میں استاد کی تحریر کا عکس ہو جائے اور شاگرد کا قلم فن کے اسرار و رموز پر اتنی کم مدت میں ایسی دست رس حاصل کر لے جیسی کہ تذکرہ گلستان سخن میں ہے ، معجزے سے کم نہیں[2]۔

۳ - صابر کے بیان کا یہ حصہ قابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں جو کلام انتخاب کیا گیا ہے اس کی تدوین کا کام بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا :

"اثنائے مشق میں ریختہ گویان پیشیں کا کلام کچھ جزودان حافظہ میں فراہم ہوتا جاتا اور کچھ گنجینۂ بیاض میں انتظام پایا تھا . . . اس عرصہ میں سخن سنجان عصر کا کلام بھی ، جو کہ طبیعت کو پسند آتا گیا اور مقصد دل کو بھاتا گیا ، اجزائے علیحدہ میں مخزون اور بیاض جداگانہ میں مشحون ہوتا رہا . . . ایک مدت کے بعد جو مجموع پر نظر

---

۱ - شہزادہ صابر کا یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے اس لیے یہ خود شعرائے دہلی میں بھی اس وقت انھیں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی ۔ شیفتہ نے ۱۲۴۸ھ تا ۱۲۵۰ھ میں اپنا تذکرہ ترتیب دیا ۔ ان پر یہ الزام ہے کہ شعرائے دہلی کو اہمیت دی ہے لیکن شیفتہ کا تذکرہ صابر کے ذکر سے خالی ہے ۔

۲ - ہاں فارسی کلام پر احسان کی زندگی میں صہبائی سے ضرور اصلاح لیا کرتے تھے ۔ (گلستان سخن صفحہ ۱۲۱)

کی تو دفتر دفتر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا اور بیکراں خزانہ مجتمع ۔ گاہ گاہ اپنے خیال میں گزرتا تھا اور کبھی کبھی کوئی دوست بھی تحریک کرتا تھا کہ اس نقود سرہ سے اغراض اور اس زر خالص سے تغافل خوب نہیں ۔ ایک ذخیرہ بہ طریق کچکول کے جمع کر لیا جاوے اور ہر مقام میں نام قائل کا بہ طور عنوان کے ترقیم کیا جاوے . . . لیکن ہجوم موانع اور کثرت مشاغل سے یہ آرزو حاصل نہ ہوتی تھی ۔ حسن اتفاق سے . . . فرزند سعادت مند محمد عمر سلطان . . . کو شعر کا شوق دامن گیر ہوا . . . اس کی تربیت اب پیش نہاد ہوئی . . . خرد کامل نے دفتر انداز وا کیا . . . ایک کتاب فراہم کر کے شعرائے معنی آفرین کا تذکرہ ہو . . . ایک معجون غریب مرکب ہو گئی . . . جناب افادت مآب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا . . . عرض کیا . . . کہ سر انجام اس امر دشوار کا کم استعداد سے معلوم ، اگر کم ترین تلامذہ کی تحریر خلعت اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان اور یہ رشتہ سر در کم نمایاں ہو جاوے ۔ بارے عرض نیاز شعار کی زیور قبول سے آراستہ ہوئی ، حلیہ اجابت سے پیراستہ ہوئی ۔"
(گلستان سخن ، صفحہ ۱۷ تا ۲۶)

یکم شعبان ۱۲۷۰ھ کو اس تذکرے کی باقاعدہ داغ بیل پڑی جس میں صرف معاصر شعراء سے سروکار رکھا گیا ہے اور ابتدا میں ایک دیباچہ ہے ، جس میں زبان کا ارتقاء فصیح اور غیر فصیح الفاظ و کلمات کی بحث ، علم عروض و قافیہ اور اقسام نظم کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں اختتام کو پہنچا ۔ ماہ شوال ۱۲۷۱ھ کا اخیر تھا کہ مطبع مرتضوی میں یہ اہتمام حافظ محمد غیاث الدین شائع ہو گیا ۔

۴ ۔ مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرے کا 'اصل متن' (جس میں شاعروں کا حال ہے) تحریر کے وقت تک کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اس کا ابتدائی خاکہ گمان غالب ہے کہ صابر ہی کا تیار کردہ ہو ؛ نظر ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائی نے ترمیم کی ہو تو عجب نہیں ، ورنہ ان شعرائے اردو کے بارے میں صابر اور صہبائی کے خیالات میں بین فرق موجود ہے ۔ انتخاب دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے اور ان کے حالات لکھ کر کلام کے بارے

میں اپنی رائے دی ہے ، یہ رائے صابر کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے ۔
یہ اختلافات ایک دوسرے کے محاذ میں ملاحظہ ہوں :

انتخاب دواوین

"نصیر ، شاہ نصیر الدین تخلص نصیر عرف میاں کلو ولد شاہ غریب کہ مشاہیر شعراء دہلی سے تھا بلکہ بہت سے شاعران زبان اردو ساکنین دہلی اسی مغفور سے تلمذ ریختہ گوئی کا کرتے تھے اور یہی صاحب عالم حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر پر فائق سمجھتے تھے ۔ بہر کیف ریختہ گوئی میں دست قدرت اچھی رکھتے تھے ۔ اواخر عمر میں دہلی سے حیدر آباد دکن مہاراجہ حاتم وقت راجہ چندو لال کی خدمت میں مشرف ہوئے اور وہاں ہی اس جہان فانی سے رحلت کی ۔ یہ چند اشعار بہ طور یادگار تذکرہ مصنفہ حکیم فاضل و افضل میر قدرت اللہ مرحوم تخلص قاسم سے اور جائے سے لیے گئے ۔

(ص ۱۲۸)

گلستان سخن

شاہ نصیر ، نصیر تخلص ، شہ سوار عرصہ سخنوری ، فارس مضمار معنی پروری ، نخل بند حدیقۂ کمال ، بانیٔ بنائے افضال ، سخن سنج ، سخن گو ، میاں کلو ، مشہور بہ شاہ نصیر الدین خلف الصدق شاہ غریب ۔ سجادہ نشینی پر جہاں مرحوم کی اسی کی ذات بابرکات سے آسمان سا اور خلافت اس عارف مغفور کی اسی کی نہاد خیر بنیاد سے خورشید سایہ تھی اور یہ مرحوم و مغفور وہ ہے کہ اس کا مزار پر انوار محلہ روشنی پورہ میں کہ ایک محلہ محلات مشہور شاہجہان آباد نزہت آباد سے ہے ، زیارت گاہ صاف باطنان پاک نہاد ہے ۔ بہر کیف شاہ موصوف ہر چند استعداد علمی سے بہرہ ور نہ تھا بلکہ سواد بھی چنداں روشن نہ تھی ، لیکن روشنیٔ طبع خداداد سے خلوت دل میں ہزار شمع معنی بزم افروز تھی ۔ کیا مرد میدان سخن وری تھا کہ بارہا ہنگامۂ مشاعرہ میں حریف ہنوز انشاد اشعار سے فارغ نہیں ہوا کہ اس نے اس کوتاہ مدت میں شمع مقابل رکھ کر اشعار سوزاں تر از

شعلۂ شمع بہ قدر دو تین غزل کے
لکھ کر مشتاقانِ سخن کے گوش گزار
کر دے - بیشتر تشبیہہ نو اور
استعارۂ جدید بہم پہنچانے میں
مصروف رہتا ہے اور شعر طرز
صائب پر کہتا ہے - بلندی تلاش
سے مشاعرے میں کسی کی غزل کو
اس کی غزل پر تفوق نہ ہوتا تھا -
سنگلاخ زمینوں کو دعویٰ داران
کمال میں سے اس کے سوا کوئی
بے سپر نہ کر سکتا - ایک بار سفر
لکھنؤ اختیار کیا ؛ جس دن یہ
شہ سوارِ عرصۂ سخن اس گل زمین
میں وارد ہو کر کاروان سرا میں
فرود آیا ، دفعتاً دردِ گردہ میں مبتلا
ہوا - قضا را خبر ورود فاش اور
ہوس مطارحہ ہر ایک کے دل میں
گرم تلاش ہوئی - ان ایام میں
مصحفی اور انشاء اللہ خاں اور مرزا
قتیل اور جرأت چار بالش حیات پر
متمکن تھے ، سب کے مشورے سے
آٹھ مصرعے مشکل زمینوں میں طرح
ہوئے اور اس مبتلائے کوفت سفر
کے پاس پہنچے - اتفاقاً مشاعرے
میں تین دن باقی رہے تھے -
معاذ اللہ سخت مشکل واقع ہوئی -
زمین وہ سنگلاخ ، طے راہ اس درد
و الم میں دشوار ، لیکن غیرت کے
تقاضے نے مامور اور اسی عرصۂ

قلیل میں اس فرمائش کے سر انجام میں مجبور کیا ۔ ان میں سے ایک کا ردیف قافیہ 'چمن سرخ ترا' اور 'دہن سرخ ترا' اور دوسرے کا 'فانوس ہیں گویا' اور 'جالینوس ہیں گویا' صیغہ جمع تھا ۔ اس مہم ضروری سے فارغ ہو کر صرف اپنی طبع کے تقاضے سے ایک اور غزل کا فکر کیا کہ اس ردیف اور قافیہ 'چمن کی مکھی' اور 'کفن کی مکھی تھا'، حسن اتفاق یہ ہے کہ اس کی شہرت کی کشش نے اکثر ساکنین شہر لکھنؤ کو اس کے حلقۂ شاگردی میں کھینچ لیا تھا ۔ روز معہود ایک جم غفیر تلامذۂ اعتقاد کیش کا ساتھ لے کر بساط مشاعرہ پر قدم رکھا ۔ کملائے فن نے جب اس زور طبع اور تیزیٔ فکر پر اطلاع پائی، صلۂ تحسین و آفرین سے شاد کیا اور حق انصاف ادا کیا ۔ یہ تحسین و آفرین کہ اس شیرینی کلام کی خوبیٔ سخن نے ان بزرگواروں سے بزور لی تھی اور پھر اس غوغائے محشر نما کے ساتھ اہل اعتساف کو ناگوار ہوئی، ایک کج طبع ستیزہ خو نے کہ شاگردان مصحفی کے زمرے سے تھا، باآواز بلند کہا کہ "شاہ صاحب فی‌الواقع ان آٹھوں غزلوں کی داد حیز قدرت

سے خارج ہے ، نویں غزل میں 'مکھی' کی ردیف سے نفیس مزاجوں کا جی متلاتا ہے ۔" اس یکہ تاز عرصۂ ظرافت نے بدیہہ کہا کہ "لطیف طبعان نفیس مزاج تو اس موائد لذیذہ کے نعما سے لذت ستاں اور کام یاب ہیں ، لیکن غالب ہے کہ علیل نہادان صفرائے حسد کو جوش غیرت سے ڈاک لگ جائے ۔" اس کی شہرت میں مدعیان سخن کو ایسا خمول تھا جیسے فروغ آفتاب میں چراغ کو ۔ اس مقام میں حق کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے ۔ کوئی اس کلام سے یہ نہ سمجھے کہ اس زمانے میں کسی کا پایۂ شاعری اس کو نہ پہنچتا تھا ، حاشا وکلا اس بزرگ کا کلام عام فہمی کے سبب سے کہ کم استعدادان تنک مایہ کے ذہن میں بہت جم جاتا اور سہولت فہم سے ہر کس و نا کس کی زبان حرف تحسین سے ہنگامۂ قیامت برپا کرتی اور معاصرین کا کلام از بس کہ خواص کی تحسین کے لائق تھا ، خواص ہر زمانے میں قلیل ہوتے ہیں ، نافہموں کے نزدیک اس کے سخن پر فائق معلوم نہ ہوتا تھا ۔ 'العاقل تکفیہ الاشارۃ' ۔ اکثر شاہ زادگان والا

شان اور امرائے بلند مکان اس کے
فیض شاگردی سے بہرہ یاب تھے
بلکہ شاہجہان آباد میں پیش تر
شعرائے عالی طبع اور موزوں طبعان
تیز فہم ، مثل شیخ ابراہیم ذوق اور
محمد مومن خان مومن تخلص اور
میر حسین تسکین اوائل حال میں
اسی کی شاگردی سے مشرف تھے -
الحاصل اطراف ہندوستان جنت نشان
کی سیر و سیاحت سے کام یاب اور
جس سرزمین میں وارد ہوا ، وہیں
کے شعرائے شیریں کلام سے معرکہ
آرا ہوا - چند بار حیدر آباد میں
جا کر راجہ چندو لال مختار سرکار
وزیر الممالک آصف جاہ نظام الملک
والی دکن کی قدر شناسی سے صلہ
نمایاں پایا - آخر کار اسی سر زمین
میں مضمون مرگ باندھا اور سوس
بہشت کی زبان سے حرف تحسین جا
سنا - سلسلہ اس کی شاعری کا
ملک الشعراء مرزا رفیع سودا تک
پہنچتا ہے ، اس طرح سے کہ یہ
شاگرد ہے مائل کا اور وہ قائم سے
مستفیض اور قائم سودا کا شاگرد
بلا واسطہ تھا -"

(ص ۳۴۷ تا ۳۴۸)

ممنون

ممنون تخلص ، نظام الدین نام ، بیٹا سید قمر الدین منت تخلص کا ہے ۔ اس کی اصل قصبہ سونی پت اور مولد و منشاء شاہجہان آباد ۔ کسب فنون اپنے والد بزرگ وار سے کیا ۔ مدت تلک لکھنؤ میں رہا ، ایک زمانہ جرگۂ شعراء پایۂ تخت حضور والا کے تھا ، چنانچہ پیش گاہ خلافت سے فخر الشعراء خطاب ہوا ، من بعد ضلع اجمیر میں پیش گاہ کمپنی بہادر سے عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز رہا ، مگر آج کل بہ باعث ضعف اعضا اور بینائی کے خانہ نشین یعنی شاہجہان آباد میں وارد ہے ۔ اوس کے کلام کی طرز نہایت دل چسپ اور شیریں ہے ۔ غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور چمن بلاغت کا طوطی شکر فشاں ، اس واسطے یہ چند اشعار بہ طور نمونہ کے اوس کے دیوان سے انتخاب ہوئے ۔ (ص ۱۹۱ ، ۱۹۲)

ممنون

ممنون تخلص ، یگانۂ عصر و وحید روزگار ، زبدۂ کملائے ہر دیار ، والیٔ اقلیم سخن وری ، مالک ملک معنی پروری ، ہم آغوش معانیٔ بکر ، ہم دوش شاہدان فکر ، چاشنی گیر مضامین دل نشین ، میر نظام الدین خلف ملک الشعراء میر قمر الدین منت غفر اللہ لھا ۔ اوصاف اس کامل الصفات کے حوصلۂ تحریر سے افزوں اور حد تقریر میں بیروں ہیں ۔ ریختے میں ایک طرز تازہ اختراع کی اور حق یہ ہے کہ بہ موجب اس فحوا کے "کل جدید لذیذ" اس کی لذت کے رو بہ رو نعمائے موائد قدما سے جی سیر ہو گیا ، پیش گاہ عنایت سلطانی سے فخر الشعراء خطاب اور دبستان لطف ازلی میں حضرت رحمان سے تلمذ کا انتساب ۔ طبیعت لآلی شاہ وار سخن کی نیساں ، دل گوہر آب دار معانی کا عماں ، بلندیٔ فکر سے کنگرۂ عرش پست اور نشۂ معانی سے اہل سخن کی طبیعتیں مست ، شوخیٔ غزل کے سامنے جوانوں کی طبع خجل ، متانت قصیدہ کے رو بہ رو پیروں کی وضع منفعل ، نمک کلام ایسا کہ ہر چند اجتماع مداد کثرت صنع کی امداد سے سعی کرے ، زبان قلم

کا زخم التیام نہ پاوے اور شیرینیٔ
ادا ایسی کہ اگرچہ حیلۂ حسد
طاقت لسان کی کمک سے اہتمام
کرے ، جز چارۂ خاموشی ہاتھ نہ
آوے ۔ نقطہ اس کی غزل میں
سوز و گداز کے اثر سے رنگ گل
اور طراوت شبنم پیدا کرے اور
دہان دوائر مضمون شور و فغاں
سے ہنگامۂ قیامت برپا ۔ تراکیب
فارسی کو زبان ریختہ سے ایسا ارتباط
بخشا کہ کمال آشنائی سے بے رنگی
کا اثر نہیں پایا جاتا اور معانیٔ
درست کو الفاظ قریب الفہم سے
اس طرح جلوہ دیا کہ ماہ سی روز
کی مانند کوتہ نظر بھی اس کے
نظارے میں دھوکا نہیں کھاتا ۔
کور سوادان کم فہم کہ اس کے
سخن بلند کے معانیٔ غریب اور
مضامین دل فریب اور نکات باریکہ
کو سمجھ نہیں سکتے ، خود اس کی
طرف التفات نہیں کرتے اور ارباب
فہم کہ سواد روشن اور طبع سلیم
رکھتے ہیں ، غرابت تشبیہہ و
استعارات اور دور آہنگیٔ تلمیح و
اشارات اور متانت تراکیب اور
رشاقت اسالیب اور برجستگیٔ نکاتہ
اور بلندیٔ ابیات میں تو کچھ سخن
نہیں کر سکتے لیکن اس غرض سے
کہ ناخن دقت کی کاوش اور طبیعت

رسا کا دخل ظاہر ہو ، کہیں کہیں سرقے کے ساتھ متہم کرتے ہیں ۔ یہ بزرگوار خیال نہیں کرتے کہ ایسا سخن سنج ُپر مایہ کہ اگر اس کے صندوق سینہ کو وا کریں ، گنجینۂ تحت العرش کے مقابل دوسرا خزینہ شہار میں آئے ، معانی پیش پا افتادۂ چند کو کس امید پر زمین بے گانہ سے التقاط کرتا اور ان سے کس افزونی کی توقع پر اپنا خزانہ بھرتا ۔ سخن چینوں کی عنان طبیعت اگر تعصب کے ہاتھ نہ ہوتی ، اس کلام میں احتمال توارد کو راہ دے کر معذور رکھتے اور باقی سخن کے لطف سے طبع انصاف کو مسرور ، اور اگر سرقے کو بھی تسلیم اور اس پاک دامن کو ناکردہ گناہ سے ماخوذ کریں ، تو بھی اگر حد اعتدال سے تجاوز اور دائرۂ انصاف سے خروج وقوع میں نہ آئے تو ان دو چار شعر کے سوا باقی کلام کو دیکھیں اور انصاف سے نظر کریں کہ اتنا سرمایہ کس صاحب قدرت کو حاصل ہوا ہے ؟ غزلوں کا ہجوم غزالان دشت ختن سے بیشتر ، قصیدوں کا انبوہ کوکبۂ سلاطین سے اکثر ، مصرعہ ہائے رباعی سے عناصر اربعہ کے مانند ابعاد ثلثہ مشحون اور ابیات قطعۂ تضعیف

بیوت شطرنج کی طرح شمار سے افزوں۔ مدت مدید تک نواح اجمیر میں عہدۂ صدر الصدوری پر مامور رہا۔ آخر ضعف پیری کے سبب سے اس مشغلے سے دست کش اور شہر شاہجہان آباد میں خانہ نشین ہوا۔ دس گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ سفر آخرت اختیار کیا۔

(ص ۲۷۸ تا ۲۸۰)

مومن

حکیم محمد مومن خاں، تخلص مومن فن شاعری میں مشاہیر دہلی میں اور نجوم و رمل میں بہت دست قدرت رکھتے ہیں۔ غرض کہ ہر فن میں یعنی زبان فارسی اور عربی اور عروض اور قوافی وغیرہ میں کامل ہیں اور صاحب دیوان۔

(ص ۲۷۸)

مومن

مومن تخلص، سخن سنج بے عدیل، محمد مومن خاں مرحوم غفر اللہ لہ۔ زمین سخن اس کی بلندیٔ فکر سے رشک افلاک اور اوج فلک اس کے علو طبع کے مقابل پستی خاک۔ عروس معنی اس کے حجلۂ طبع میں شوخ و برجستہ، راز غیب اس کے سینۂ قلم میں سر بستہ، خامہ اس کے سوز معنی سے نخل اور ورق اس کے فروغ مضامین سے مطلع نور۔ مصرع آہ اس کی غزل عاشقانہ میں تضمین اور اسرار یقین اس کے ابیات عارفہ میں گوشہ گزیں۔ سخن سنجان عصر ہر چند بالا دوی فکر سے عرش تاز تھے؛ لیکن جو کہ یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا، ہر سر بلند اس کو پست اور ہر

بزرگ اس کو خورد نظر آتا ہے اور
وہ بے تصنع اس کا نام اسی پندار
کے موافق زبان پر لاتا اور ہر چند
مساحان اقلیم کمال منازل دور و
دراز طے کر کے نشیب و فراز راہ
سے واقف اور راہ بیراہہ سخن سے
آگاہ تھے لیکن بس کہ یہ چابک
خرام کمال پیش بینی سے مراحل
بے شمار باقی پاتا تھا ، ان کو کاہل
قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار
ریش خند کرتا اور ان تیز قدموں
کو نقش پائے نارسا تر بتاتا ۔ جو کہ
کوتاہ بینان روز گار اس والا پائگی
اور علوہمت سے آگاہ نہ تھے ،
اس کی نگاہ کو عیب میں اس کی
زبان کو خردہ گیر تصور کر کے
زبان سرزنش دراز اور طومار شکوہ
دراز کرتے ۔ ایک دیوان ضخیم کہ
اصناف سخن پر مشتمل اور اس کے
سامنے فصاحت سحبانی خجل ہے اور
مثنویات متعددہ مثل قصہ غم اور
شکایت ستم ، قول غمیں اور تف
آتشیں ، اس قادر الکلام سے صفحہ
روزگار پر یادگار ہیں ۔ ہر چند زبان
اردو میں تو علم یکتائی بلند ہی
تھا لیکن کمال مہارت فارسی سے
کوس ' لمن الملک ' کی صدا نے
ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطی
ہند و بلبل شیراز کو دم بہ خود

کر دیا تھا ۔ غزل ہائے فارسی کاغذ
پارہ ہائے پراگندہ پر مثبت اور
بالفعل محبت طبیعی اور قرابت قریبہ
کے تقاضے سے اس کی تبییض میر
عبدالرحمان آہی تخلص ، خلف
میر حسین تسکین کے عہدۂ اہتمام
میں ہے اور جو کہ وحید عصر نسیج
اوحد ، جالینوس زماں ، بقراط آواں ،
حکیم احسن اللہ خاں سلمہ الرحمان
کو شفائے مرضی کے اہتمام سے قدم
بڑھا کر احیائے اموات اور معجزۂ
مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے ،
قریب ہے کہ وہ دیوان منصۂ طبع
میں جلوہ گر ہو کر شہرت تمام
پیدا کرے ۔ اتفاقات قضا و قدر
سے ایک روز ایک مکان کے بام بلند
پر عروج معنی کے تصور میں تھا
کہ ناگاہ لغزش پائے اوج سخن سے
پستیٔ زمین کی طرف مائل اور
مضمون پیش پا افتادہ کی جانب
متوجہ کیا ۔ ہر چند اس بام کی
بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی ،
لیکن کچھ آسمان کی کج روی اور
کچھ زمین کی ناہمواری سے دست و
بازو میں ضرب شدید پہنچی ۔ اس
شدت الم میں اس حادثۂ جاں کاہ
کی تاریخ یہ پائی ، گویا پاؤں کا
پھسلنا بام معنی کی نرد بان تھا :

مومن فتاد از بام گفتم چه رفت گفتا
خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
چند ماہ انواع شدائد نے رنج دیا
کہ ان کا تحمل حدِ بشر سے خارج
تھا ۔ آخر الامر اسی سال میں کہ
بارہ سو اٹھسٹھ (اڑسٹھ) ہجری تھی ،
سفر آخرت اختیار کر کے وابستگان
جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ
میں مبتلا اور حوران فردوس کو
سعادت استقبال سے مستعد کیا ۔
اس امر ناگزیر کے کئی مہینے کے
بعد نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ
تخلص کہ انسان صورت و ملک
سیرت ہیں ، رویائے صادقہ میں
دیکھتے ہیں کہ گویا مومن خاں
کا خط آیا ہے اور اس کے خاتمے
پر خط سبز سے مرقوم ہے "مومن
اہل الجنہ" ۔ وسعت رحمت سے
کیا بعید ہے کہ جوش دریائے
مغفرت نے اس مستحق کرامت کے
دامن کو لوث عصیاں سے پاک
کر دیا ہو ۔ صدق اللہ عز و جل قال
عذابی اصیب آمن اشاء و رحمتی
وسعت کل شیء :
ابر رحمت سخت بے پروا خرام است اے صدف
تاکدامی قطرہ ایں جا باز گرداند عناں
(ص ۹۱ - ۳۸۹)

ذوق

ذوق تخلص ، شیخ محمد ابراہیم نام ، ذوق تخلص ، طوطی شکرستان شیریں

ذوق

دہلوی ۔ خطاب خاقانیٔ ہند ۔ تیس برس کے عرصے سے ملازم درگاہ حالت ولی عہدی سے شاہ حال دہلوی کے ہیں اور فن شعر میں بھی ابتدائی عمر سے مصروف ہیں ۔ اب اس زمانے میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلے کا نہیں اور اکثر مشاعروں میں اوس کی آتش زبانی کے آگے اور شعراء مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے ، شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں ۔ لہذا یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے ، بہ طریق یادگار لکھے جاتے ہیں ۔

(ص ۲۴۹ تا ۲۵۰)

زبانی ، بلبل چمن زار رنگیں بیانی ، صیرفی نقود کمال ، دستہ بند رنگینیٔ مقال ، بانی بنائے فصاحت ، میزاب گلشن بلاغت ، فارس مضمار سخن وری ، شہ سوار عرصۂ معنی پروری ، مسند نشین ایوان دانش و آگاہی ، استاد حضرت ظل سبحانی ، شیخ ابراہیم مخاطب بہ خاقانیٔ ہند ۔ مایۂ تربیت ظل سبحانی میں شب جوانی کو صبح پیری تک پہنچا دیا اور رضائے مرشد آفاق میں اپنی ہوائے نفسانی کو یک قلم مٹا دیا ۔ خسرو روزگار کی بدولت جس قدر درجہ اعتبار کا بلند ہوا ، مرتبہ پندار کا پست اور جتنا دبستان کمال میں ہوشیار ہوا ، مے کدۂ عرفان میں مست ۔ کوہ اس گراں قدر کے پلۂ وقار میں کاہ ، آفتاب روشن اس صاف دل کے فروغ ضمیر کے مقابل سیاہ ۔ بلندیٔ مرتبہ کو لباس خاکساری میں ایسا چھپایا تھا کہ جیسے گرد میں آسمان ، رعونت تونگری کو فقر میں ایسا دبایا تھا جیسے زمین کے نیچے گنج شائیگاں ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ اس تازہ گفتار کی طبیعت کیا گلشن سراسر بہار اور کیا گلزار سراپا نگار تھی کہ فضلہ اس کا سبزہ و ریاحین سے بہتر اور خاشاک اس کا بنفشہ و سنبل سے

خوش تر - بجوم قافلۂ معنی سے
ہر بیت میں معانی کثیر منزل گزیں ،
اور کثرت ورود مضامین سے ہر
مصرعے میں مضامین متعدد
گوشہ نشیں - ہر چند کثرت انواع
سخن سے خود ترتیب دیوان کی
طرف التفات نہیں کی ، لیکن اکثر
احبائے صداقت کیش اور تلامذۂ
اخلاص اندیش ان اشعار گوہر نثار
سے بڑی بڑی بیاضیں فراہم رکھتے
ہیں اور شب و روز مانند فرزند عزیز
کے سینے سے منضم ---ماہ صفر سنہ
بارہ سو اکہتر ہجری میں مرض
اسہال نے اشتداد اور 'اعراض
گوناں گوں' نے اشتداد بہم پہنچا
کر لشکر طبیعت پر شب خون کیا
اور ضعف سابق اس مرض کا سر بار
اور اس علت کا علاوہ تھا -
باوجودیکہ زبان کو یارائے حرف زنی
اور لب کو طاقت جنبش باقی نہ
تھی ، صفائے باطن اور جلائے آئینہ
ضمیر کے اقتضا سے جو جو نگارخانۂ
جہان قدس سے اضافہ ہوتا تھا ،
بے اختیار انفاس فیض اقتباس کے
ہم راہ محفل اظہار میں جلوہ گری
کرتا تھا - اس کے نفس مطمئنہ کو
مبدأ فیاض سے کیا نسبت خاص تھی
کہ وہ واردات غیبی جن سوانح سے
مشعر تھیں ان کا ظہور جلوہ گاہ

وقوع میں بے تکلف معائنہ ہوا -
اسی اثنا میں گنجینہ داران خزینۂ
تحت العرش نے یہ گوہر بے بہا اس
جوہریٔ سخن پر عرض کیا :
کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
اور طرفہ یہ ہے کہ جب وہ دن
گزر گیا اور شب چہار شنبہ آخری
ماہ صفر نے (بہ آں کہ اس کی
حیات سے ہنوز ایک رمق باق
تھی) نقابِ سیاہ چہرۂ روزگار پر
ڈال دی ، کشادہ پیشانی خراب آباد
عالم صوری سے دل اٹھا کر مسیحان
صومعۂ نیل گوں کے ہم پا گلشنِ
جناں کی طرف راہی ہوا -
(ص ۳۴۲ ، ۳۴۳ ، ۳۴۴ ، ۳۴۶)

ناسخ

ناسخ تخلص ، شیخ امام بخش نام ،
لکھنوی - تمام عمر لکھنؤ میں بسر
کی - ایک دفعہ وہاں کے حاکم سے
کچھ رنجیدہ ہو کر الہ آباد کو
چلا گیا ، پھر وہاں سے کان پور میں
آیا - بعد اوس کے زمانہ جو موافق
ہوا ، وطن میں پھر گیا - اب دو تین
برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے
طرف عالم جاودانی کے رحلت کی -
الغرض کہ ناسخ ناسخ تھا -
(ص ۲۱۲)

ناسخ

ناسخ تخلص ، سنج سخن بے عدیل
و نظیر ، شیخ امام بخش ناسخ ،
ساکن خاک لطافت بنیاد لکھنؤ -
مشاہیر شعرائے خوش سخن اور
نام آوران کامل فن سے تھا - اس
کے فکر سے معنی کو تاب و بہا اور
اس کی زبان سے الفاظ کو رونق و
صفا - ذہن کی صفائی یوسف رخان
غیب کا آئینہ ، قلم کا شگاف ارباب
کشف کا سینہ - رسائی فکر گوہر
وحی صندوق سینۂ جبریل سے تاراج

کر لیتی تھی اور صید افگنیٔ غور نخچیر وقت کو کمین گاہ گوش قارون سے آماج کر لیتی ۔ وحشی مضمون ہنوز دام خرد میں صید نہیں ہوا کہ اس کے اندیشے کی کمند نیم تاب کی کشاد میں صحرائے عدم کی اس سرحد میں پہنچ کر حائل گردن ہو جاتی تھی اور طائر معانی اب تک عقل فعال قفس میں قید نہیں کہ اس کی طبیعت کی رسائی ایک پرواز میں آشیانۂ غیب مطلق سے شکار کر لاتی تھی۔ معنیٔ بستہ اس کی طبع کی اوج بخشی سے بلند اور الفاظ مکروہ اس کی تراکیب کے حلیے سے دل پسند۔ اگر غریب نواز نہ ہوتا معنی کی طرف اس قدر التفات نہ کرتا اور اگر آشنا پروری منظور نہ ہوتی الفاظ کی اتنی رعایت نہ کرتا ۔ معنیٔ مبتذل اس کے تصرف سے غریب اور اوج فلک اس کے فکر کے سامنے نشیب ۔ گرسنہ چشمان ہنر اس کے مائدۂ سخن سے زلہ بردار ، دعوے داران کمال اس کی شوکت الفاظ سے پائمال ۔ اہل انصاف اس کو استاد مانتے ہیں اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں ۔ متانت مزاج سے مضامین شوخ باوجود آمد کے آورد کے محتاج اور تمکین طبیعت

سے معانیٔ برجستہ کو خلوت خیال
سے دروازۂ لب تک آنے میں تکلف
کی احتیاج - ہر چند طریقۂ مختار اس
کا تمثیل ہے اور فی‌الواقع اس طرز
میں بے مثل و عدیل ہے ، شعر
عاشقانہ بھی اگر بے اختیار زبان
قلم سے نکل گیا ہے شعلۂ شمع کی
طرح سے پروانہ طینتوں کی طبع میں
آتش افگن اور برگ گل کی مانند
عندلیب مزاجوں کو ناخن بہ دل
زن ہے - اخیر عمر میں غلبۂ
خرافت سے جرأت کی وضع کو اختیار
اور معاملہ بندی کو قصد کیا اور
ایک 'دفتر پریشان' نام اسی طرز کے
اشعار سے مشحون اور اسی ڈھنگ
کے ابیات سے مالا مال لکھا - ہر
چند جرأت کی شاعری کا حال جیسا
ہے ، اہل بصیرت اور ارباب بصارت
کہ کامل استعداد اور ملکۂ سخن
کے نقاد ہیں ، خوب جانتے ہیں ،
لیکن جو کہ ہمیشہ مضامین ہوس
و کنار اس کے منہ چڑھے ہوئے اور
مدام اس کی فکر سے ہم کنار تھے
اور یہ اس ہوس کے دام میں تو
گرفتار - یہ تقلید خوب بن نہ آئی
اور بعض مقام میں یہ تو ناز و
انداز میں محو ہوا اور شاہد معنی
نے اس کو غافل کر کے بے باکانہ
حجلہ گاہ ابیات سے اپنے گھر کی

راہ لی :
"حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء"
لیکن درد مندان سخن جانتے ہیں
کہ اتنی نا سرہ کاری سے اس کے
نقد کمال کو بٹا نہیں لگتا - کہتے
ہیں کہ ایک دفعہ بود و باش خطۂ
خوش آب و ہوائے لکھنؤ سے دل
گرفتہ ہو کر الہ آباد کی سر زمین
میں نشیمن اختیار کیا ، لیکن بعد
ایک عرصے کے کان پور میں آیا
اور وہاں وقفۂ آسائش کر کے پھر
وطن مالوف میں منزل گزیں ہوا
اور جب تک آغوش لحد میں آرام
نہ کیا ، اس گل زمین سے قدم باہر
نہ نکالا - اس کے سفر آخرت کو
تخمیناً آٹھ سات برس کا عرصہ ہوتا
ہے - (ص ۳۱۴ - ۳۱۵)

گلستان سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور گہری معلومات کے علاوہ انتخاب دواوین کی بیان کردہ آرا سے مختلف بھی ہیں ؛ خصوصاً ممنون اور ناسخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں اور اس بدلے ہوئے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں جو صابر اور اسی عمر کے بعض دوسرے نقادان فن کے ہاں جلوہ گر ہے - گلستان سخن میں شعراء کے حالات و کوائف بھی صہبائی سے جداگانہ ذوق کے آئینہ دار ہیں - اب ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ گلستان سخن کا اصل متن صہبائی کی اصلاح سے مزین تو ہوگا لیکن صابر کا اپنا تالیف کردہ ہی سمجھنا چاہیے - ہاں دونوں کے اسلوب میں مشابہت ضرور ہے اور اسلوب کی مشابہت کا سبب اصلاح ہو سکتا ہے ؛ لیکن نفس مضمون استاد اور شاگرد کا جدا ہے -

(۳)

(۱) گلستان سخن کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بعض ضروری اجزاء ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

(۲) گلستان سخن میں ۵۳۰ شعرا کے مستقل تراجم ہیں۔ مسلمان ۳۸۲ ، ہندو ۵۶ ، عیسائی ۲ اور ان میں عورتیں صرف دو ہیں اور دونوں مسلمان (پہلی یقینی طور پر ، دوسری قیاساً)۔ مسلمانوں میں ایسے شعرا جن کے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اشعار تذکرے میں ہیں ۱۶ ہیں ...

ایسے شعرا جن کا صرف فارسی کلام ہے ، ۲۳ ہیں۔ باقی وہ ہیں جن کا صرف اردو کلام دیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں صرف ایک شاعر کا اردو فارسی کلام تذکرے میں درج ہے ، ۱۷ کے صرف فارسی اشعار ہیں۔ اور ایسے شعرا جن کا صرف اردو کلام ہے ، ۳۸ ہیں۔ عیسائیوں اور عورتوں کے صرف اردو اشعار ہیں۔

(۳) مقامی حیثیت سے دیکھیے تو دہلی ، جہاں کے ۳۷۵[۱] شعرا تذکرے میں ہیں ، اور تمام مقامات پر غالب ہے ، لکھنؤ کے صرف ۱۶ شعرا قابل شمول سمجھے گئے ہیں ، باقی شعرا دوسرے مقامات کے ہیں جن میں غالباً سب زیادہ آگرے کے ہیں۔

سری رام کا یہ قول تو صحیح نہیں کہ مصنف نے دہلی سے باہر قدم رکھنا عار سمجھا ہے لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ بہ کثرت بیرونی مشاہیر مثلاً برق ، رشک ، صبا ، نوازش وغیرہ نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ دہلی کے بارے میں مصنف کو ایک حد تک دعویٰ تھا لیکن وہاں کے بھی متعدد خوش گو شعرا (مثلاً مجروح ، ظہیر ، انور وغیرہ) کسی نہ کسی وجہ سے گلستان سخن میں داخل نہ ہو سکے۔ ہاں ایسے لوگ جس کا صابر و صہبائی سے تعلق ہے (خواہ ان کی مشق چند روز ہی کیوں نہ ہو) تذکرے میں شامل ہیں۔

۱۔ بعض اوقات یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کون شاعر کہاں کا ہے۔ میں نے بعض صورتوں میں قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ (ق - ع - و)

(۴) زمانۂ تالیف تذکرہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے اور صوفیہ ، اوباش اور رند مشرب ، امرا اور بازاری ، بادشاہ اور شاہ زادے سب کو اس کا ذوق تھا ۔ تیموری خاندان کے شعرا جن کا اس تذکرے میں ذکر ہے ، ۲۰ ہیں ۔

(۵) اس امر سے کہ پہلے تذکرے کا نام آثارالمعاصرین رکھا گیا تھا ، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں صرف وہی شعرا ہیں جو اصطلاحی معنی میں صابر کے ہم عصر تھے ، اس لیے کہ اس میں فراق و قاسم وغیرہ ہیں جو صابر کیا صہبائی کے بھی ہم عصر نہیں کہے جا سکتے ۔

(۶) گلستان سخن (مقدمہ مقصد) میں دہلی کے جن اساتذہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو زمانۂ تالیف سے بہت قبل وفات پاچکے تھے (نصیر ، ممنون) اور وہ بھی جو اس قدر کم عمر تھے کہ شاید صہبائی کے خاص حلقے سے باہر انہیں استاد نہ سمجھا جاتا ہو (مثلاً سوز) ۔ آزردہ کا ذکر سب سے علیحدہ کیا ہے اور انہیں سب سے بڑھایا ہے لیکن یہ غالباً مصلحت کی بنا پر ہے ۔ نہ وہ اس کے مستحق ہیں اور نہ صہبائی و صابر انہیں واقعی اتنا بڑا سمجھتے ہوں گے ۔

تذکرے کا آغاز بھی انہیں سے ہوا ہے (حالانکہ مقررہ قاعدے کے مطابق آباد سے ہونا تھا) ۔ اساتذہ کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کھل کر بات نہیں کہنا چاہتا ، یا کم از کم اس کی ذمہ داری خود قبول کرنا نہیں چاہتا ؛ مثلاً مومن کی خود بینی کا ذکر ۔ اظہار رائے میں ذمہ داری کا احساس کار فرما نظر نہیں آتا ۔ صہبائی سوز و صابر کی آواز گری (پروپیگنڈہ) تالیف تذکرہ کی سب سے بڑی غرض معلوم ہوتی ہے ۔

(۷) بعض غیر مشہور شعرا کے حالات میں واقعہ نگاری سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مشاہیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ تاہم بہت سی کام کی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں اور آزاد نے آب حیات میں اس سے کئی جگہ کام لیا ہے (مثلاً حالات شاہ نصیر) ، گو اس کا اعتراف نہیں کیا ۔ یہ تذکرہ سخن شعرا کے بھی ماخذوں میں ہے ۔ خود اس تذکرے میں گلشن بے خار کے سوا کسی تذکرے سے کوئی بات نہیں

لی گئی ، بعض اور تذکروں کا ذکر اس میں ضرور ہے ۔

(۸) گلستان سخن میں التزاماً تلمذ کا ذکر نہیں ، خاص خاص شعرا کے شاگردوں کی تعداد جو مجھے اس کتاب سے معلوم ہوئی ، یہ ہے : صہبائی ۳۸ (اس میں درسیات پڑھنے والے بھی شامل ہیں) نصیر ۲۹ ، احسان ۳ ، ذوق ۲۲ ، مومن ۲۱ ، مشیر ۱۵ ، صابر ۱۴ ، غالب (بہ شمول حزیں) ۱۲ ، ممنون ۸ ، ... سوز ۳ ، تنویر ۳ ، آزردہ ۲ ، عارف ۲ ، ثابت (موخرالذکر کے بارے میں لکھا ہے کہ اولاد تیموریہ میں بیشتر اسی صاحب طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں) ۔

واضح رہے کہ میں نے احتیاط سے گنا ہے لیکن شمار کرنے میں غلطی کا احتمال ہے ۔ میں نے صرف ان شعرا کو لیا ہے جن کے بارے میں صراحتہً لکھا ہے کہ کس کے شاگرد ہیں ۔ اپنے معلومات یا قیاس سے کام نہیں لیا ۔ اگر کسی شاعر کو ایک سے زیادہ استادوں سے تلمذ ہے تو اس کا شمار سب استادوں شاگردوں میں کیا گیا ہے ۔

(۹) واقعات جب بیان کیے جاتے ہوں کتاب میں زیادہ تر ایسے لوگوں کا ذکر ہو جنھیں جاننے کے مواقع حاصل ہیں تو اغلاط زیادہ نہیں ہوسکتے ، لیکن دہلوی شعرا ہوں یا بیرونی ، تھوڑے بہت اغلاط ان کے متعلق موجود ہیں ، مثلاً سرور کے استاد کا تخلص سامی لکھا ہے حالاں کہ یہ ساقی ہے (تذکرۂ سرور) ، میر ببر علی انیس کا نام میر پر علی لکھا ہے ۔

اور تذکرہ نگاروں کی طرح گلستان سخن کے مؤلف نے بھی حالات کی فراہمی میں زیادہ زحمت اٹھانی گوارا نہیں کی اور سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہوسکا ہے پیش کر دیا ہے ؛ مثلاً حزیں دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عارف سے تلمذ تھا ، غالب ہے کہ اب غالب سے اصلاح لیتے ہوں گے ۔ خلاصہ یہ کہ ولی عہد کے نوکر تھے یہ آسانی تحقیق کی جا سکتی تھی کہ وفات عارف کے بعد کس کا تلمذ اختیار کیا تھا ۔

(۱۰) شاعروں کے تراجم کے ساتھ جو ان کے اشعار ہیں ان کی تعداد یہ ہے : فارسی ۹۲۹ - سید کے دو مصرع (و مادہائے تاریخ) مزید برآں ، اردو ۳۶۱۴ ، مخمس کے ۲۶ بند ۔ ان کے علاوہ مقدمے میں جو اشعار ہیں وہ اس تعداد میں شامل نہیں ۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے لوگوں کے اشعار

بھی بھر دیے ہیں جن کے اشعار کچھ بلند پایہ نہیں - غلط انتساب کی صرف ایک مثال اس وقت میرے علم میں ہے :

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

یہ میر انیس کی طرف منسوب ہے لیکن تذکرہ قدرت اللہ شوق میں جو میر انیس کی ولادت سے قبل کی تالیف ہے، ایک گمنام شاعر کے نام سے ہے -

(۱۱) کتاب کی عبارت نامانوس عربی و فارسی مفردات و مرکبات سے مملو ہے اور اس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں اردو کا لطف ملتا ہو - بے نمک استعارات، خنک تشابیہہ، دور از کار کنائے، مزید برآں ظاہر ہے کہ اس صورت میں بے ارادہ حقیقت سے انحراف ہو جانے کا بہت کچھ احتمال ہے اور ایسا ہوا ہے -

(۱۲) مقدمے میں بہت سی غیر ضروری باتیں ہیں لیکن جس زمانے میں لکھا گیا ہے اس لحاظ سے غنیمت ہے - توافق لسانین پر مؤلف کی نظر ہے، اگرچہ غلط مثالیں بھی دی ہیں - لفظوں کی اصل معلوم کرنے کا بھی شوق ہے، اگرچہ اس میں یہی بعض جگہ دھوکا کھایا ہے - دساتیر سے متعلق طویل بحث ہے - دساتیر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے مگر یہ تعجب کی بات نہیں کہ اپنے معاصرین کی طرح مؤلف کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ یہ جعلی ہے اور حواشی وغیرہ میں جن کتابوں کا ذکر ہے یا تو ان کا وجود ہی نہیں یا یہ بھی جعلی ہیں اور شکل اول میں اقتباسات محض فرضی ہیں[1] -

(۳)

قاضی صاحب کے ان اقتباسات سے گلستان سخن کی اہمیت پر کافی روشنی پڑتی ہے - صابر نے اگرچہ مشاعروں کے حالات دینے میں زیادہ محنت

۱ - غالب نے قاطع برہان میں ایک معلم (صریح اشارہ بہ صہبائی) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خویشتاب اور زندہ رود کے مطالعے کا تجربہ ذکر کرتا ہے حالاں کہ ان سے فارسی نہیں آ سکتی (صہبائی اس کا مدعی نہیں) - صہبائی کی کسی کتاب میں جو ان کے نام سے چھپی ہے اور میری نظر سے گزری ہے ان کتابوں کا ذکر نہیں اور غالب نے گلستان سخن ہی کو دیکھ کر قاطع میں ان پر الزام لگایا ہے -

سے کام نہیں لیا ، تاہم اپنے معاصرین کے بارے میں انھوں نے بعض نئی معلومات ضرور مہیا کی ہیں ، مثلاً دلی میں منعقد ہونے والے بعض مشاعروں کے بارے میں ہمیں با خبر کیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل مشاعروں کا حال گلستان سخن سے معلوم ہوتا ہے :

صفحہ ۲۲۹ : مشاعرہ مدرسۂ غازی الدین کا ذکر اور آشفتہ کے انتقال کا واقعہ ۔

صفحہ ۲۶۳ : مشاعرۂ دیوان خانۂ والد مرزا وجیہ الدین اختر ۔

صفحہ ۳۱۷ : مشاعرۂ مدرسۂ غازی الدین کا تفصیلی ذکر اور شاہ نصیر کا طرحی غزلیں کہنا ۔

صفحہ ۳۱۵ : مشاعرۂ دربار عام ۔

صفحہ ۳۹۴ : مجلس مشاعرہ ۔

صفحہ ۵۳۱ : مشاعرۂ پر مکان شیفتہ ۔

اس کے علاوہ اس تذکرے کی تاریخی اہمیت بھی ہے اس زمانے میں استاد شاگرد کی روایت بڑی اہمیت رکھتی تھی ، اس لیے جا بجا مختلف شعرا کے اساتذہ کا پابندی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے اپنے دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں میں یہ تذکرہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں شعرا کے حسب نسب کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی ہے ۔ اگرچہ تذکرہ نگار اس بات کا پابند نہیں کہ ہر معاصر کے بارے میں جو تحریر تذکرہ سے پہلے یا دوران میں فوت ہوا ہے ، پابندی کے ساتھ سنۂ وفات دے ، لیکن بعض شعراء کے حال میں صابر سنہ بھی درج کر گئے ہیں ، جس سے مورخ کے لیے آسانی پیدا ہوگئی ہے ۔

اس تذکرے کی تیسری خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے نے شخصیت نگاری کو خاص اہمیت دی ہے ۔ چنانچہ اپنے بعض معاصر شعرا کے بارے میں ان کی آرا دلچسپ ہیں ، مثلاً :

صفحہ ۲۵۸ : احمد ۔ مروت و دوست نوازی میں یکتائے زمانہ ۔

صفحہ ۲۶۵ : ارشاد ۔ درویش صاف طینت ، پاک نہاد ۔

صفحہ ۲۷۱ : اشکی - فکر خوش ، طبع رسا ، ذہن سلیم ، اطوار حمیدہ ، عادات پسندیدہ ، ایک ذات میں جمع ہیں -

صفحہ ۲۷۵ : امین - باوجود ان کمالات کے حلم مجسم اور ہمہ تن اخلاق - ان کے لب کو برگ گل کی طرح سے کبھی تبسم سے اور ان کی پیشانی کو شگوفے کی مانند شگفتگی سے خالی نہیں پایا -

صفحہ ۲۷۸ : امیر - تقریر شستہ اور گفتگوے شائستہ اور روزمرہ صاف پر قادر تھا -

صفحہ ۲۸۱ بر میاں اوج کا خاکہ کمال فن کا ثبوت ہے -

صفحہ ۳۰۶ : جلیس - مرد سپاہی وضع ، مودب ، کم گو تھا -

صفحہ ۳۷۳ : داغ - صاف دل ، نیک نہاد -

صفحہ ۲۱۸ آباد - ہم صحبتان آوارہ مزاج کے اختلاط سے تحصیل کمال کی طرف قاطبتاً توجہ نہیں -

صفحہ ۲۱۹ : آتش - بہ اعتبار تخلص کے آتش تھا ، بہ اعتبار تواضع کے خاک ؛ بہ اعتبار تن سست تھا ، بہ اعتبار فکر کے چالاک -

صفحہ ۲۲۶ : آزاد - خوش فکر ، ذکی الطبع ، شوق علم تصوف نے ضمیر حقیقت تخمیر پر استیلا پایا ہے - جوان خوبصورت ، وجیہہ ، رند مشرب ، بے باک مزاج ، آزاد وضع ، گویا اسم با مسمیٰ ہیں -

صفحہ ۲۳۶ : آصف - مرد صاحب اخلاق و رنگیں صحبت -

صفحہ ۲۳۷ آفی - یاد حق میں مشغول ، آزادانہ بسر کرتے ہیں اور بیشتر اوقات سیاحت و سفر خصوصاً زیارت اولیا میں گزارتے ہیں -

اشراف پرستی کے اس زمانے میں جب حسب نسب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی ، مغلیہ تمدن کے باقیات میں سلیقے اور آداب مجلس کو بڑی شہرت ملی - گلستان سخن کا مرتب بھی مغلیہ تمدن کی مٹتی ہوئی قدروں کا امانت دار ہے - مختلف شعرا کی شخصیتوں میں وہ مجلسی زندگی کے اصول تلاش کرتا ہے اور ان کی مدد سے ہمیں اس معاشرتی فضا کی جھلک دکھاتا ہے ، جس کے ٹوٹے ہوئے رشتے تاریخ ، مکتوبات ، تذکروں وغیرہ

میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں - اس لحاظ سے گلستان سخن اردو تذکروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے - جن شعرا کا ذکر اس میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے ساتھ مرتب کے تعلقات تھے اس لیے اس کی بیان کردہ معلومات قابل اعتبار ہیں اور آخری مغلیہ دور کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے -

(۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنی کتاب شعرائے اردو کے تذکرے میں قدیم تذکروں کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد تذکرہ نگاری کو ارتقاء کے اعتبار سے دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا ، جو یہ ہیں :

طبقۂ اول : قدیم طرز کے تذکرے :

(الف) دبستان میر : یعنی وہ تذکرے جو میر تقی میر کی خصوصیات تذکرہ نگاری کا تتبع کرتے ہیں - واقعات میں اختصار اور اصلاح سخن ان تذکروں کے امتیازات ہیں - مثلاً :

(۱) نکات‌الشعرا میر تقی میر (۲) تذکرۂ ریختہ گویاں ، فتح علی حسینی - (۳) مخزن نکات ، قائم (۴) تذکرہ میر حسن دہلوی (۵) مصحفی کے تذکرے -

(ب) دبستان میر کے خلاف رد عمل : یہ رد عمل میر کی اختصار پسندی کے خلاف ہے اور اس کا نتیجہ اختصار کی بجائے "جامعیت بہ لحاظ اسماء و افراد ہے -" عیارالشعراء اس جامعیت کا بڑا نمائندہ ہے - جامعیت پسند تذکروں کی فہرست یہ ہے :

(۱) عیارالشعراء ذکا-(۲) عمدۂ ، منتخبۂ ، اعظم‌الدولہ سرور (۳) مجموعہ نغز ، حکیم قدرت اللہ قاسم - (۴) گلشن بے خار ، شیفتہ - (۵) گلستان بے خزاں ، باطن -

طبقۂ ثانی : جدید اثرات کے حامل تذکرے :

(الف) ان تذکروں میں سوانحیت کا رنگ غالب ہے - ان میں صرف منتخب شعراً کے مفصل حالات زندگی ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی معین کی گئی ہیں - ان تذکروں کے نام یہ ہیں :-

(۱) گلزار ابراہیم - (۲) گلشن ہند علی لطف -

(ب) دتاسی ، کریم الدین اور صہبائی کے تذکرے - ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا ارتقاء بھی مطالعے میں آ جائے -

(ج) آب حیات ، آزاد - تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رنگ - بعد کے بیشتر تذکرہ نویس اس معاملے میں مولانا آزاد کا تتبع کرتے ہیں -"[1] گلستان سخن اس تقسیم میں طبقۂ ثانی کی ب شق میں آتا ہے -

(۹)

اردو شعرا کے تذکروں میں فارسی تذکروں کی طرح ایک ہی روایت چلتی رہی ہے جس کے بارے میں اب تک بعض غلط فہمیاں ادباء میں رائج ہیں - چنانچہ تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر کلیم الدین احمد "اردو تنقید پر ایک نظر" میں اس روایت کا خاص طور پر مذاق اڑاتے ہیں - ان کی رائے میں اردو تذکرے عبارت آرائی کا شکار ہیں اور ہر جگہ الفاظ کا سیلاب رواں ہے[2] - ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے میں مشرق تنقیدی نظریات کا کوئی منظم ، مسلسل اور مربوط سلسلہ نہیں ملتا[3] - اسی طرح ڈاکٹر عبدالقیوم "تنقیدی نقوش" میں ہمارے تذکروں میں تنقیدی شعور کی کمی کا رونا روتے ہیں ، لیکن ان صاحبوں کی آراء زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں ، اس لیے کہ انھوں نے اردو تذکروں کو اس دور کی ادبی اور معاشرتی فضا سے الگ کرکے دیکھا ہے - ان تذکروں میں بیان کیے گئے تنقیدی خیالات کی صحت یا عدم صحت کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے ، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں میں سرے سے تنقیدی شعور ہی موجود نہیں ، درست نہ ہوگا - مسیح الزماں صاحب نے قدیم تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بالکل بجا کہا ہے :

> "کون کہہ سکتا ہے کہ غدر سے پہلے کے اردو شاعروں میں تنقیدی شعور نہیں تھا - اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک ایسے دور

---

۱ - شعرائے اردو کے تذکرے ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، صفحہ ۱۲-۱۳ -

۲ - اردو تنقید پر ایک نظر : طبع اول ، صفحہ ۱۸ -

۳ - اردو تنقید کا ارتقاء : صفحہ ۶۲ -

میں پیدا ہوئے تھے جب خیال سے زیادہ الفاظ پر زور دیا جاتا تھا ۔ جب بات کہنے کا طریقہ بات سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا[1] ۔"

اردو تذکرہ نگاروں کے ہاں یہ تنقیدی شعور مختلف ادوار میں یکساں قوی نہیں رہا ۔ میر تقی میر اور ان کے معاصرین کے ہاں الفاظ پر خیالات کو فوقیت حاصل ہے اور وہ تنقیدی اصطلاحات ، جنھیں پروفیسر کلیم الدین احمد "الفاظ کا سیلاب" کہتے ہیں ، غیر محتاط طریقے پر استعمال نہیں ہوئیں ؛ بلکہ ہر لفظ کا ایک مقرر اور معین معنی ہے ، جس کے حوالے سے میر اور ان کے ساتھی اپنا ما فی الضمیر ادا کرتے ہیں ، یہ دوسری بات ہے کہ ان کے بنیادی تصورات محدود ہیں اور اسالیب کی باریکیوں میں یہ لوگ دور تک نکل جاتے تھے ۔ میر کے بعد میر حسن اور ان کے معاصرین کی تذکرہ نگاری کا زمانہ آتا ہے ، جب تنقیدی سے سوانحی حصہ زیادہ اہم ہو گیا اور تذکروں میں حالات و واقعات نے تنقید سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ، لیکن اس زمانے میں بھی عروض و معانی و بیان اور صنائع بدائع کے معارف سانچے تنقیدی آراء میں دخل انداز رہے ۔ اس تنقیدی روایت میں بھی تبدیلی آئی ۔ مصحفی اور ان کے ساتھیوں نے غزل کی غنائی روایت کو خصوصی اہمیت دی ۔ یہ نیا تنقیدی سعور اردو تذکرہ نگاری کی قدیم روایت میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے ۔ تنقید اب معاشرتی فضا سے ہم آہنگ رہ کر تنقیدی شعور کی تربیت میں لگی رہی ۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج میں تذکرہ نگاری کا ایک اور دبستان وجود میں آتا ہے جس نے سوانحی رنگ کو زیادہ نکھار دیا ۔ یہ نیا انداز تذکرہ نگاری مسلسل نہ رہ سکا ، تا آنکہ دلی اور لکھنؤ میں تذکرہ نگاری کا وہ انداز شروع ہوا جس میں شعراء کی تعداد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ۔ اسی زمانے میں گلشن بے خزاں ، عیار الشعراء ، خوش معرکۂ زیبا ، سراپا سخن اور عمدۂ منتخبہ وغیرہ لکھے گئے ۔ یہ قدیم دبستان تذکرہ نگاری کا آخری زمانہ ہے جب معاشرتی زندگی میں زوال پذیر عناصر کی کثرت کی وجہ سے ، نیز زبان پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہو جانے کے سبب ، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ادب متاثر ہونا شروع

۱ ۔ اردو تنقید کی تاریخ ، جلد اول ، صفحہ ۱۵۸ ۔

ہو گئے تھے ۔ دلی اور لکھنؤ کے اس دور کی تذکرہ نگاری کا عام رجحان سوانحی حصے پر توجہ کی بجائے شخصیت اور تنقید کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے ۔ گویا اس مرحلے پر اردو تذکرے شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے اوصاف سے متصف ہو کر اردو تنقید میں ایک نئے رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ شعرا کی شخصیت کے بارے میں رائیں تذکروں میں عام ہوجاتی ہیں ، استادی شاگردی کے سلسلے اہمیت حاصل کر جاتے ہیں اور تنقید میں لفظی گرفت اور مناظرے اور مناقشے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ شعراء کی وفات کے سنین بھی غیر محتاط صورت میں قلم بند ہونے لگے ۔ اس دور کے تنہا محتاط تذکرہ نگار عبدالغفور خاں نساخ ہیں جنھوں نے 'سخن شعراء' میں شاعروں کی تاریخ وفات کو اکثر احتیاط کے ساتھ درج کیا ہے ۔ سبب شاید یہ ہے کہ نساخ دلی اور لکھنؤ کے شہروں سے بہت دور زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے وہ ان شہروں میں پروان چڑھنے والی بعض قباحتوں سے بچ گئے ۔ مجموعی اعتبار سے یہ دور سماجی اور سیاسی زوال کا ہے ۔ معاشرتی زندگی کی ابتری کا اثر تذکروں پر بھی پڑا ۔ اب تذکروں میں تنقیدی رائیں گروہ بندی کا شکار ہو جاتی ہیں ۔ شیفتہ اور ان کے معاصرین کی تحریریں اس طرح کے خارجی عوامل سے خالی نہیں ہیں جو معاشرتی زندگی کی بربادی اور بد نظمی کو آشکار کرتے ہیں ۔ شیفتہ البتہ الفاظ کے استعمال میں Under tone کو مد نظر رکھتے ہیں ۔ ان کے تذکرے کی عبارتیں بظاہر غیر محتاط عبارت آرائی محسوس ہوتی ہیں لیکن در حقیقت لفظوں کے اس بے دریغ استعمال کی تہہ میں بعض دوسرے ضمنی اور ذیلی اشارے بھی پائے جاتے ہیں جن سے شیفتہ کا تذکرہ ایک دل چسپ دستاویز بن گیا ہے ، ورنہ اس آخری دور کے قدیم رنگ کے تذکرہ نگاروں کے ہاں الفاظ کا سیلاب پایا جاتا ہے اور یہ سیلاب (جس کے خلاف ڈاکٹر عبادت ، کلیم الدین احمد وغیرہ نے زہر اُگلا ہے) کچھ کچھ ان کتابوں تک بھی جا پہنچا ہے جنھیں جدید اثرات کے حامل تذکرے کہا جاتا ہے ۔ ان نئے تذکروں میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقا کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور ایک حد تک تنقید کی اُن گم شدہ کڑیوں کو بھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس دور کے ادبا کے لیے بالکل سامنے کی چیزیں تھیں اور جنھیں عام طور پر قلم بند نہیں کیا جاتا تھا ، لیکن آج ہمارے لیے

ان کڑیوں کی موجودگی کے بغیر قدیم تنقیدی روایت کو سمجھنا خاصا مشکل ہوتا ۔

تذکرہ نگاری کی یہ ترمیم شدہ روایت جس کا آغاز گارسیں دتاسی ، کریم الدین ، صہبائی اور گلستان سخن کے مرتب نے کیا ہے ، شاعری کے تاریخی ارتقا کو مد نظر رکھتی ہے اور مختلف دور کے شاعروں کو ایک خاص پس منظر میں پیش کرتی ہے ۔ اس سے اردو تذکرہ نگاری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ یہ دور کچھ تو نئی فضا کی خوبیاں رکھتا ہے اور کچھ اس میں قدیم زوال پذیر تمدنی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں ۔

ان تذکروں کا ڈھانچہ بہ قول مسیح الزمان :

"تذکروں سے الگ تاریخ ادب کے ڈھنگ پر ہے ۔ یہ تصور دتاسی کا مرہون منت ہے جس کا سوچنے کا ڈھنگ اور تجزیے کا طریقہ اردو کے دوسرے تذکرہ نگاروں سے مختلف تھا اور اسی وجہ سے اس نے اردو ادب کی ایسی تاریخ لکھی جو بہت کچھ مغربی طرز کی تھی جس میں مبالغہ کم اور بیان واقع زیادہ تھا[1] ۔"

دتاسی کی یہ احتیاط اس کے اپنے مقلدین کو بھی صرف ایک حد تک متاثر کر پائی اور بہ شمول کریم الدین ، ان تذکرہ نگاروں سے واقعات کی صحت کا اہتمام زیادہ نہیں ہو سکا ۔ ان دانش مندوں کی تنقیدی آراء ایک حد تک جچی تلی ہونے کے باوجود لفاظی اور لفظوں کے بے ضرورت استعمال کی طرف راغب ہیں ۔ ان کی اکثر تنقیدی اصطلاحات مبہم اور غیر معین ہیں ۔ گلستان سخن اس لحاظ سے اپنے معاصر تذکروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے کہ اس میں اکثر معاصرین سے سروکار رکھا گیا ہے ۔ اس فاضل تذکرہ نگار کی توجہ شعرا کی شخصیت اور ان کے اسادی شاگردی کے سلسلوں کی طرف زیادہ رہی ، تنقیدی رائے میں وہ اپنے دور کا ہونے کی وجہ سے ، معروضی انداز اختیار نہیں کر سکا ، اس لیے اس کی بیان کردہ آراء مجموعی طور پر زیادہ وقیع نہیں ہیں ۔ چنانچہ جن عبارتوں اور تنقیدی اصطلاحوں میں شعراء پر تنقید کی گئی ہے وہ مبہم اور غیر واضح بھی ہیں ۔ چند مقامات پر البتہ

۱ - اردو تنقید کی تاریخ ، پہلی جلد ، صفحہ ۱۲۳ ۔

ان کی رائے میں بھی وہی وہ انداز آ گیا ہے جس کی وجہ سے ہم میر اور ان کے معاصرین کے تذکروں کو خاص اہمیت دیتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اس تذکرے کا سلسلہ اپنے دور سے قدیم تر تذکروں کے ساتھ جا ملتا ہے ، تاہم دوسرے قدیم تذکروں کے مقابلے میں اس میں شعر کی ماہیت ، تخلیقی عمل ، شعری روایت اور انتقاد کا سرمایہ کم ہے ۔ سبب شاید یہ ہے کہ مولوی امام بخش صہبائی باوجودیکہ دہلی کالج سے متعلق تھے اور شاعری کا جو تعلق قدیم نظام معانی و بیان کے ساتھ تھا ، نیز شعری عمل میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے ، اس سے ایک حد تک واقف تھے اور انھوں نے اپنے انتخاب دواوین میں نہ صرف شعرا کے زمانی قرب کو قائم رکھا ہے بلکہ شاعری سے متعلق بعض مسائل کو بھی دیباچے میں بیان کر دیا ہے ، پھر بھی ان کے ہاں تاریخ نگاری ہی کا پلہ بھاری ہے ۔ گلستان سخن کا حالات والا حصہ بگمان غالب ان کے شاگرد کی تالیف ہے ، اس لیے شعرا کا حال اس عیب سے خالی نہیں ۔ کتاب کے شروع میں فن شعر سے متعلق جملہ معلومات درج ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار شعری سرمائے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا ہے ۔ اس کے باوجود یہ نقطۂ نظر شعرا کے حال میں آ کر ایک بڑی حد تک سرد پڑ جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ اپنے دور کی دونوں متضاد تحریکات کے زیر اثر ہے کہ ایک طرف اس میں گارسیں دتاسی کی قائم کردہ روایت کی جھلک موجود ہے اور دوسری طرف اس کا تنقیدی مزاج اپنے دور کی زوال آمادہ روایت سے منسلک ہے ۔

سوانحی حصے پر اگرچہ اس تذکرے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض دوسری ضمنی معلومات کی وجہ گلستان سخن کا مرتب ضرور اپنے بعض دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے سبقت لے گیا ہے ۔ تذکرے کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے غالب اور ان کے معاصرین کے بعض تنقیدی رجحانات اور ذوق ادب کی بعض بدلتی ہوئی صورتوں کا سراغ ملتا ہے ۔ اس لیے آخری دور کے تذکروں میں گلستان سخن کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے ۔

بنیادی اردو—ایک تجزیہ

(۱)

بنیادی اردو ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مرکزی بورڈ کی ایک تجویز کے مطابق تیار کی ہے ۔ یہ ان بنیادی الفاظ کی فہرست ہے ، جو روز مرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے "وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو نہیں کم سے کم مدت میں اردو میں اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں اور روز مرہ گفتگو اور کاروبار میں اپنا مفہوم واضح کر سکتے ہیں" (تعارف صفحہ ۷)۔ گویا یہ بنیادی انگریزی کی طرز پر ترتیب دیا ہوا مجموعۂ الفاظ ہے جس میں مرتبین کا مقصد جدید لسانیات کی روشنی میں ایسا ذخیرۂ الفاظ فراہم کرنا ہے جس کی مدد سے غیر ملکی اردو میں روز مرہ کی گفتگو ، اور کاروباری مطالب ادا کر سکیں ۔ یہ ذخیرۂ الفاظ مرتبین کے قول کے مطابق روز مرہ بول چال سے اخذ کیے گیے ہیں ۔ بول چال سے اخذ کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ؟ مرتبین نے اس کی وضاحت نہیں کی اور صرف اس قدر بتانا کافی سمجھا ہے کہ کتاب کے مرتب جدید لسانیاتی اصولوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر چکے ہیں ۔ کیا یہ ذخیرۂ الفاظ اردو کے عام اخبارات سے جمع کیا گیا ہے ؟ کیا پاکستانی سکولوں کے طلبا اور طالبات کی گفتگو کو ٹیپ کر کے حاصل کیا گیا ہے ؟ کیا اس ذخیرۂ الفاظ کی جمع آوری میں دیہات اور شہر کی معاشرتی زندگی کے جملہ پہلو مرتبین کے پیش نظر تھے ؟ کیا غیر ممالک سے آنے والوں کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ الفاظ یکجا کیے گیے ہیں ؟ ان سوالوں کا جواب اس کتاب میں نہیں ملتا ۔ ناقص اور آسان طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایک طبقے یا پاکستان کے کسی شہر کے بسنے والے ایک بخصوص گھرانے کو اردو کا نمائندہ قرار دے کر لغت تیار کرلی جائے یا پھر کوئی اچھی سی ڈکشنری سامنے رکھ کر اپنے ذوق کے مطابق بعض لفظ چھانٹ لیے جائیں ۔ مجھے شبہ ہے کہ زیر نظر تالیف میں یہی دو آخری طریقے استعمال ہوئے ہیں ۔

(۲)

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس کے زندہ اور متحرک الفاظ وہ ہیں جو یہاں کی شہری اور دیہاتی زندگی کے کاروباری ، نجی ، ادبی اور فکری سوتوں کے ساتھ براہ راست ہم آہنگ ہیں - وہ الفاظ روزمرہ اور محاورات نسبتاً غیر متحرک اور جامد ہیں جو یہاں کے رسم و رواج ، عام رہن سہن ، عمومی ضروریات اور مذہبی و معاشرتی ، اقتصادی اور سیاسی حالات اور معتقدات سے صرف دور کا علاقہ رکھتے ہیں - بنیادی اردو کا ذخیرۂ الفاظ چھانٹنے کے لیے جہاں ایک طرف ایک غیر ملکی معاشرے کی شخصی ضروریات کو سامنے رکھنا ہوگا وہاں پاکستان کے شہری حلقے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - شہری آبادی میں بھی ابھی دو طبقے نمایاں ہیں جو ابھی تک جذب ہوکر ایک وحدت نہیں بن پائے - اس لیے ماہر لسانیات کا اولین فرض ہے کہ وہ غیر ملکوں کو زبان کے ان متعارف اور کثیرالاستعمال عناصر سے روشناس کرائے جو اس کی روز مرہ کی ضروریات اور عام گفتگو کے تقاضے پورے کر سکیں - یہاں ادبی زبان مفید نہیں ہو سکتی - بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے - اردو کے سلسلے میں یہ فرق کچھ اور بھی زیادہ ہے ؛ کیونکہ اردو کا ادبی ڈھانچہ زیادہ تر لکھنؤ اور دلی کی روایت کے زیر اثر پروان چڑھا ہے - ادبی زبان پاکستان کی علاقائی بولیوں سے مغائرت رکھتی ہے - یہ مغائرت اور فاصلے صحافتی حلقے میں بہت کم ہیں ، اس لیے پاکستان میں بول چال کی اردو کے قریب تر کوئی شکل ہو سکتی ہے تو وہ صحافت ہی میں ہے اس لیے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یا تو بنیادی اردو کا ذخیرہ پاکستان کے اخبارات سے جمع کیا جائے یا پھر زیادہ موزوں طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف طبقات قوم سے چند افراد (جن تک ایک سوالنامے کے ذریعے رسائی حاصل کی جائے) اس کے بعد لفظوں کا تمدد (Friquency) اور غیرملکیوں کی عمومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے فہرست تیار کرنا زیادہ مناسب تھا -

(۳)

معاشرتی زندگی سے متعلق ذخیرہ الفاظ مرتبین کے نقطۂ نظر کی چغلی

کھاتا ہے ، پان خوری کو پاکستان میں عوامی زندگی میں کوئی سماجی مرتبہ حاصل نہیں - بنیادی اردو کے مرتب اسے بہت پسند کرتے ہیں اور اس کے جملہ لوازم کے لیے ذخیرہ الفاظ مہیا کرتے ہیں :-

جونا - چھالیا - کتھا - الائچی - پان -

یہ الفاظ ہماری دیہاتی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے اور شہری زندگی میں بھی ایک محدود طبقے کے معمولات میں شامل ہیں - دیہاتی زندگی میں جو الفاظ اہم ہو سکتے ہیں وہ پان اور اس کے متعلقات نہیں بلکہ مندرجہ ذیل الفاظ ہیں :-

چرخہ - چکی - جھاج - چارپائی - کھیس - کلہاڑا - ہل - درانتی - گوبر - بیل - ریڑا - کھرپل - کھانچا - گودڑ - کھڈ - کھدا - ان میں ہل اور بیل کے سوا باقی کسی لفظ کو درج نہیں کیا گیا - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی اردو کے مرتبین نے دیہات کو چنداں اہمیت نہیں دی اور شہروں سے زیادہ سروکار رکھا ہے - اگر ایسا ہے تو پاکستان کی شہری زندگی سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کی کثرت ہونی چاہیے - یوں تو بھارت اور پاکستان کے علاقوں میں کم و بیش سبھی ترکاریاں اور دالیں کھانے پکانے میں کام آتی ہیں لیکن بعض دالیں اور ترکاریاں یو پی میں زیادہ مقبول نہیں - بعض یہاں زیادہ مقبول ہیں - بنیادی اردو کے سلسلے میں یہاں دال سبزیوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی - کھانوں میں بھی قلیے ، قورمے ، پوری کچوری کے مقابلے میں پاکستان میں پراٹھوں، مکی کی روٹی اور ساگ وغیرہ کا رواج زیادہ ہے - چند مقبول ترکاریاں اور دالیں یہ ہیں :-

مٹر - چنا - آلو - ارہر - ارد - ساگ - کدو - گاجر - گوبھی - مونگرا - بینگن - ٹماٹر - مونگ -

ان میں بنیادی اردو کی بارگاہ میں صرف شلجم - آلو - چنے - بینگن - کدو - ٹماٹر اور مٹر کو باریابی کا شرف حاصل ہوسکی ہے - دوسری کثرت سے استعمال ہونی والی ترکاریاں اور دالیں نظر انداز ہوگئی ہیں -

باورچی خانے کے لوازم ملاحظہ ہوں :-

روٹی - آٹا - آتش دان - آملیٹ - چلمچی - دسترخوان - ناشتہ - نہاری - خمیر بیسن - مرتبان - کاچھ - اناردانہ -

ان میں کوئی لفظ بنیادی اردو کا شمار نہیں ہوا ۔ بیچارہ پراٹھا منہ تکتا رہ گیا ہے ، اس کی جگہ پوری براجمان ہے ، پنیر اور قورمہ کی حکومت ہے ۔ اس سے ایک غیر ملکی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ پاکستان کے مقبول اور معروف کھانے یہی ہیں ۔

پھلوں کے بارے میں بھی فاضل مرتبین کی معلومات ناکافی ہیں ۔ بعض پھلوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا :۔

چلغوزہ ۔ خوبانی ۔ بادام ۔ آڑو ۔ ناشپاتی ۔ مونگ پھلی ۔ مالٹا ۔ گرما ۔ کیلا ۔ ناریل ۔ کنوں ۔ خربوزہ ۔ پستہ ۔ تربوز ۔

یہ ہمارے دانش وروں کو پسند نہیں ۔ ان کی نظر میں پاکستان کے مشہور اور معروف پھل صرف یہ ہیں : ۔

آم ۔ پپیتا ۔ سنگترہ ۔ اخروٹ ۔ ککڑی اور امرود ۔ سہارنپور اور لکھنؤ کے آس پاس کے آم ناگپور کے سنگترے ، لکھنؤ کی ککڑیاں ۔ الہ آباد کے امرود بہت مشہور ہیں ۔ ہمارے ہاں حال ہی میں ان پھلوں کی کچھ بہتر فصلیں ہونے لگی ہیں ورنہ ہمارے ہاں کے زیادہ مقبول پھل تو جامن ، کیلا مالٹا ، خربوزہ ، تربوز اور کنوں ہیں یا پھر کسی حد تک ملتان کے آم ۔

مرتبین کی معلومات حد درجہ ناقص معلوم ہوتی ہیں ۔ مذہبی عقاید و شعائر سے متعلق یہ الفاظ عمومی استعمال کے ہو سکتے ہیں :

نماز ۔ ثواب ۔ قرآن ۔ مسجد ۔ محرم ۔ محفل ۔ تسبیح ۔ داڑھی ۔ عشا ۔ فجر ۔ ظہر ۔ عصر ۔ قربانی ۔ محراب ۔ ملا ۔ موذن ۔ گنبد ۔ تراویح ۔ زکوۃ ۔

ان میں سے صرف نماز ۔ ثواب ، زکوۃ ، قرآن ۔ مسجد ۔ محفل اور محرم کا ذکر ہوا ہے ۔ باقی الفاظ مرتبین کے خیال میں قابل ذکر نہ تھے ۔

(۳)

ذخیرۂ الفاظ کی اس کمی بیشی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو مرتبین بول چال کی اردو اور معیاری ادبی اردو میں کوئی فرق نہیں کر پائے یا پھر ان کے سامنے بول چال کا وہ پیمانہ ہے جو شہری زندگی کے صرف ایک طبقے کے خیالات و احساسات کا ترجمان ہے اور اس کا پاکستان پر

اطلاق ممکن نہیں یا پھر انھوں نے کسی لغت سے اپنی پسند کے الفاظ چھانٹ لیے ہیں اور اسے اعلیٰ بنیادی اردو کا نام دے رہا ہے -

غیر ملکیوں کی ضروریات کو لیجیے انھیں ابتدا میں جن محکموں اور کاروباری معاملات سے سابقہ پڑ سکتا ہے اس میں بحری جہاز ، ہوائی جہاز ، ریل ، ٹیکسی کے علاوہ پولیس سٹیشن ، پاسپورٹ آفس ، ٹیلی فون ، تار گھر ، ڈاک خانہ کے علاوہ نجی زندگی میں حکومت کے عہدے داروں ، اپنے ذاتی ملازمین اور کاروباری لوگوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگی اور گھر کی عام استعمال کی چیزوں کے ناموں اور افعال و مصادر سے زیادہ سروکار ہوگا - انگریزی زبان کے مستعمل الفاظ میں بنیادی اردو میں صرف یہ لفظ ملتے ہیں :

اسٹیشن - جیل - سائیکل - پولیس - پارسل - قلی - کمرا -
ہماری دانست میں انگریزی کے یہ الفاظ بھی کام آسکتے ہیں :
بالٹی - بوٹ - بیگ - بیچ - پیڈل - ٹیلی فون - تھیٹر - جج - ڈیسک -
ربڑ - ریڈیو - سرکس - سنیما - کموڈ - کیمرا - گیٹس - لیمپ - مسٹر - ہارن - ہیٹ - ہیٹر -

ایک غیر ملکی کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ بھی مفید ہو سکتے ہیں :
پین - تسمہ - تولیہ - جراب - چابک - چارپائی - سوئی -
اسے مختلف پیشہ وروں سے بھی سابقہ پڑے گا - اس لیے یہ الفاظ بھی قابل غور ہیں :-

بڑھئی - بہشتی - بھنگی - جولاہہ - دھوبی - لوہار - نائی - ملاح -
مندرجہ ذیل افعال کا اضافہ بھی مفید ہوگا :-
سنوار (سنوارنا) - لپک (لپکنا) - ٹانک (ٹانکنا) اور خراٹا (خراٹے لینا)

ضرورت ہے کہ بنیادی اردو پر نظر ثانی کی جائے اور اسے سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ موجودہ حالت میں یہ کتاب نہ تو غیر ملکیوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے اور وہ اس سے پاکستان کی معاشرتی زندگی کا صحیح نقشہ سامنے آتا ہے -

حوالہ جات قانون فوجداری

محبوب عالم شیخ کی کتاب "حوالہجات قونون فوجداری" اردو کے عدالتی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ماتحت عدالتوں کے عملے کو قانون کی ایسی کتاب کی بہت ضرورت رہتی ہے جس کی مدد سے وہ روزمرہ کے امور بہ آسانی انجام دے سکے۔ اصل کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن اس طرح کی امدادی کتب کی افادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عام فہم زبان اور سادہ اور راست طریق اظہار اور قانونی دفعات کی عملی صورتوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے تشریحات ایک مفید اور از حد اہم خدمت ہے۔ شیخ صاحب نے اس کام کو کچھ اس اختصار سے ڈیڑھ دو سو صفحات میں سمیٹ دیا ہے کہ ان کی کتاب نہ تو قانون فوجداری کی وہ دقیق دستاویز ہے جس کے لیے توضیح و تشریح کی ضرورت ہو اور نہ اس حد تک مفصل ہے کہ اسے پڑھنا اور اس سے استفادہ کرنا خود ایک مستقل اور ہمہ وقتی کام متصور ہو۔ ان کی کتاب ایک ایسی تلخیص ہے جسے فوری حوالے کے طور پر برتا جا سکے گا۔

کتاب کو مختلف ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر شی سے متعلق ضروری معلومات یک جا بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں یہ طریقہ تلخیص نیا نہیں، درسی کتب کی اس ڈھب کی فرہنگیں پہلے بھی چھپتی رہتی ہیں بلکہ جب سے قانون کی کتب کی تدوین اردو میں شروع ہوئی ہے۔ قانون دانوں نے ایسی کتابوں کی ضرورت کو بیش از بیش محسوس کیا۔ ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ قانون کو اردو میں ڈھالنے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں اور قانونی لغت کی تدوین کے علاوہ ضابطہ ہائے فوجداری کی تنظیم و ترتیب بھی انیسویں صدی کے وسط تک خاصی ہو گئی۔ کئی اہم کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں انگریزوں اور ہندوؤں کے کارنامے اہم تھے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے تعزیرات ہند کے ترجمے سے قانونی زبان

کو وہ پیکر مہیا ہوا جس سے اردو زبان میں قانون کی مستقل علمی و ادبی روایت قائم ہوئی ۔ یہ روایت پنجاب میں برطانوی تسلط کے بعد سے عدالتوں میں اردو کی اہمیت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ۔ قانونی کتب کی تلخیصات میں بھی اضافہ ہوا اور گائیڈ بکوں کا ذخیرہ وافر جمع ہو گیا ۔ اس کے علاوہ عدالتی فیصلے اور سرکار بھی اردو میں چھپنے لگے ۔ پنجاب کا پہلا عدالتی رسالہ ''گنج شایگان'' کے نام سے جاری ہوا ۔ اس میں عدالتی فیصلوں اور سرکلرز کو اردو میں شائع کیا جاتا رہا ۔ کتب کی تدوین و اشاعت کا کام بھی بکثرت ہوا ۔ یہ کام زیادہ تر ہندو وکلاء اور منشیوں کے ہاتھ میں تھا ۔ عدالت عالیہ پنجاب کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک قانونی کتب کا زیادہ ذخیرہ ہندو مصنفین ہی کی مساعی کا مرہون منت ہے ۔ ان مصنفین نے قانونی گائیڈیں بھی کثیر تعداد میں شائع کیں ۔ ان کتب کی قانونی حیثیت تو ضرور تھی لیکن ادبی لحاظ سے یہ کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں تھیں ۔ لے دے کر منشی گلاب دین یا ایک آدھ اور مسلمان وکیل صاحب تصنیف ہوا ، جس نے قانونی زبان کو ادبی سطح پر لے جانے کی شعوری کوشش کی اور اس طرح قانونی سرمایہ ادب میں مسلمان طبقے کی طرف سے اہم خدمت انجام دی ۔ ہندو وکلا کی کتابیں اگرچہ محنت اور احتیاط کے اعلیٰ معیار پر تھیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے ادبی سانچے میں ڈھلی ہوئی نہ تھیں ، بلکہ بعض کتابیں تو ادبی لحاظ سے بھی خاصی ناقص اور پُر از اغلاط تھیں ۔ اردو میں زمانہ قدیم سے کتابوں کی تدوین کے باوجود عدالتی زبان کو خاص علمی معیار تک پہنچنے میں خاصی مدت صرف ہو گئی اور اس کی صحیح تربیت مسلمان وکلا ہی کے ہاتھ سے ممکن ہوئی ۔ اس اہم خدمت میں پنجاب کا پلہ بھاری ہے ۔

زبان کی پنجابی روایت کو ادبی سطح تک لے جانے میں تعزیرات پاکستان کی نشر و اشاعت کو بہت دخل ہے ۔ اعلیٰ عدالتوں میں انگریزی کے چلن کی وجہ سے اردو کو دائرہ قانون وہ مقام میسر نہ آیا جو ایک قومی زبان کو حاصل ہونا چاہیے تھا ، تاہم ماتحت عدالتوں میں زبان کی ساکھ کسی حد تک برقرار رہی ۔ پنجاب لاء سکول اور اورینٹل سکول میں مختاری کے امتحانات کا سلسلہ رائج رہا ۔ قانون کی تدریس کا اردو میں اہتمام تھا ۔ یہاں کے فارغ التحصیل وکلا اور مختار پنجاب کی ماتحت عدالتوں میں کام

کرتے تھے - یہ لوگ جو انگریزی کی زیادہ شد بد نہ رکھتے تھے لیکن اردو کے ذریعے قانونی قابلیت کا سکہ جمائے رہے - ابتدا میں اعلیٰ عدالتوں میں بھی اردو کا چلن تھا لیکن جب وکالت کے امتحانوں سے اردو کو دیس نکالا مل گیا تو اردو کی حیثیت جو اسے عدالت عالیہ میں حاصل تھی قائم نہ رہ سکی اور سمٹ سمٹا کر ماتحت عدالتوں تک محدود رہ گئی - لاء کالج کی کلاسوں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم رکھا گیا اور اردو کا دائرہ کار محدود و محصور ہوا - ماتحت عدالتوں اور پولیس تھانوں میں اردو کی قانونی زبان کی آب یاری ہوتی رہی - اس سطح پر قانون کا تعلق عوام کے ساتھ تھا اب اس رابطے کی بنا پر مقامی زبان کے تال میل سے اردو کی قانونی زبان ایک نیا روپ اختیار کر گئی - زیر نظر کتاب بھی اسی عدالتی زبان میں لکھی گئی ہے جس کے خمیر میں اردو کی عدالتی زبان کا پس منظر شامل ہے اور مقامی روایات کی حسین و شائستگی بھی جھلک رہی ہے - کتاب میں عدالتی زبان کے مقامی الفاظ کو مناسب اہمیت دی گئی ہے - اس کے علاوہ انگریزی فارسی اور عربی اصطلاحات کے باہمی تال میل سے بھی یہ زبان نئی اور مضبوط روایت کے احیاء کا باعث ہو گئی ہے - جملوں کی وضع قطع ، حروف ربط کے استعمال اور واحد جمع کے مقامی قاعدوں سے اردو زبان کے مروجہ محتاط رویوں کی جگہ زبان کا فطری جوہر چمک گیا ہے یہ کتاب اردو کے شاعرانہ پیرایۂ اظہار کی بجائے بول چال کے سانچوں کے زیادہ قریب ہے اور یہی سبب اس کی عبارتوں کی دلکشی اور اصوات کے آہنگ کا ہے - اس کتاب کے جمع اور واحد کے قواعد بھی ناسخ کی ادبی روایت کی تردید کرتے ہیں اور انگریزی اور عربی فارسی الفاظ کے مابین اضافت اور حروف ربط کے استعمال کی کثرت بھی زبان کے لسانی پیکر کو ایک نیا حسن اور نئی آب و تاب عطا کرتی ہے - قانون نویسی کی یہ روایت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کا ایک سرا قانون کی پرانی مروجہ زبان کے ساتھ ہے اور دوسرا سرا کاروباری اور بول چال کی زبان سے مربوط ہے - کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ فاضل مصنف نے زبان کو خواہ مخواہ شاعرانہ بنانے کی کوشش نہیں کی - ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ ہم سائنٹفک علوم کے لیے بھی شاعرانہ پیرایۂ اظہار کو اختیار کر لیتے ہیں جو زبان کے علاوہ ان علوم کے ساتھ بھی نا انصافی کا موجب ہوتا ہے - فاضل مصنف نے اس

ہمارے میں نہایت صحیح راستہ اختیار کیا ہے کیونکہ اردو میں علوم کی روایت کو مستحکم کرنے کے لیے زبان کا سائنٹفک طریق مفید ہو سکتا ہے ، اس میں جذباتی انداز بیان کی گنجائش نہیں - دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہر جگہ ادبی زبان علمی زبان سے مختلف رہی ہے اور اردو کو بھی اگر علمی زبان بننا ہے تو یہی مسلک لینا پڑے گا کیونکہ علمی موضوعات میں جذباتی لب و لہجہ نہ کار آمد ہے نہ موزوں ہے - مقام شکر ہے کہ ہمارے ماہرین قانون نے ادبی اور علمی زبان کے اس فرق کو شروع ہی سے پیش نظر رکھا اور اپنے روبوں کو مولوی نذیر احمد کی تعزیرات ہند کی اساس پر استوار کیا - محبوب عالم شیخ صاحب نے بھی اسی علمی روایت سے اپنا چراغ جلایا ہے - یہ کوشش قانون کے لسانی سانچے کے لیے بڑی مبارک اور کارگر رہی - نئے اختیار کردہ لسانی سانچوں میں مقامی عناصر کے میل سے علمی نثر کا ایک نرالا آہنگ نمودار ہوا ہے - میری رائے میں اس کتاب کا یہ پہلو بہت اہم ہے - شیخ صاحب کی اردو اہل زبان کی ٹکسالی اردو نہیں اور اسے ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے تھا میرے خیال میں ان کی شاعرانہ زبان سے اجتناب ہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے - جملوں کی ساخت میں انگریزی قانونی زبان کی طرح ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ اور توازن ہے اس توازن کے علاوہ اس میں قطعیت اور جامعیت بھی ہے جس سے نثر میں عالمانہ شان پیدا ہو گئی ہے - شیخ صاحب کا اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے علمی مسائل کے بیان کے لیے ایک ایسا سانچا اختیار کیا جو اس اہم علمی خدمت کے لیے حد درجہ موزوں تھا -

کتاب کی قانونی خوبیوں کی داد تو قانون دان ہی دے سکتے ہیں لیکن مجھے اس کتاب کا یہ پہلو بہت پسند آیا ہے کہ کتاب ٹیکنیکل ہونے کے باوجود اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ کہیں بھی بیان میں پیچیدگی یا ژولیدگی نہیں آئی - مختصر اور جامع انداز میں ایک عام قاری کو قانون کے دشوار مسائل پانی کر کے بتائے گئے ہیں - یہ خوبی اپنے پیشے سے محبت اور خلوص کے علاوہ اس مہارت کی دلیل بھی ہے کہ انھوں نے کئی برس عدالتی ملازمت میں بسر کیے اور علمی تربیت حاصل کی وہ ماتحت عدالتوں کے عملے کی ضرورتوں اور مشکلات سے بخوبی آگاہ ہیں - ان کے ہاں اختصار کے ساتھ ساتھ ضروری مسائل کے اہم گوشوں کو سیدھے سادے انداز میں

بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک اہم درسی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے ۔

علمی لحاظ سے بھی کتاب کا اسلوب قابل قدر ہے ۔ فاضل مصنف نے جو زبان استعمال کی ہے اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے ۔ اس قانونی نثر میں اتنی جان ہے کہ ہماری عدالتوں کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکے ۔ یہ کہنا بھی شاید بے موقع نہ ہو کہ اس عمدہ نثر میں کہیں کہیں کھردرا پن بھی آ گیا ہے ، لیکن یہ خامی نثر کی نہیں ، یہ خامی اس کے کم تر استعمال کی ہے ۔ جیسے جیسے یہی زبان استعمال میں آتی جائے گی اس کے کھردرے کنارے خود بخود صاف ہوتے جائیں گے ۔ نثر کا سڈول پن اس بات کی سفارش ہے کہ عدالتی زبان میں اس کا تجربہ ضرور کیا جائے ۔ آخر کار یہی نثر ڈھل کر ، نکھر کر مقبول و محمود ہو جائے گی ۔

عدالت عالیہ کے حالیہ فیصلے کے بعد جس میں وکلا کو اردو میں پیروی کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے ، اب اردو کی ضرورت اور اہمیت یقیناً بڑھ جائے گی ۔ ایسے میں شیخ صاحب کی زیر نظر کتاب اگر اہم کردار ادا کر سکے تو اردو زبان کی بہی خواہوں کے لیے یہ مسرت و شادمانی کا سبب ہوگا ۔

مشرق میں فہرست سازی کی روایت

(۱)

مشرق میں فہرست سازی کی روایت بہت قدیم سے چلی آ رہی ہے ، چنانچہ قلمی کتب کی فہرستوں میں حاجی خلیفہ اور ابن ندیم کے نام آج بھی احترام سے لیے جاتے ہیں اور ان کے کارنامے عصر حاضر میں بھی کتب حوالہ میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں ۔ خود برصغیر پاک و ہند میں اس نوع کی فہرست سازی کی کمی نہیں ۔ خطی نسخوں کے بارے میں الگ الگ معلومات کی جمع آوری بھی بذات خود اہم رہی ہے ۔ چنانچہ حیدر آباد دکن کے ذخائر کی فہرستوں ، کتاب خانہ رامپور کی قدیم فہارس ، اسلامیہ کالج پشاور کی فہرستوں کو اس ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے ؛ لیکن یورپ میں اس موضوع پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں معلومات کی درجہ بندی کے علاوہ ترسیل معلومات کو زیادہ سائنٹفک بنانے کی کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں ۔ کتاب داری نے فن کی صورت اختیار کی تو فہرست سازی کا فن بھی زیادہ سائنٹفک ہو گیا ، چنانچہ مطبوعات اور مخطوطات کی جداگانہ فہارس کا اہتمام ہوا ۔ فہرست سازی کا دائرہ عمل بھی کتابیاتی تدوین نو کا باعث بن گیا ۔ اب فہرست ، کتاب کے نام ، مصنف کی شناخت اور نسخے کے سال کتابت تک محدود نہ رہی ، رفتہ رفتہ معلومات کے دائرے میں بھی وسعت پیدا ہوئی ۔ قلمی نسخوں کے مصنفین کے حالات زندگی ، نسخوں کے آغاز و انجام کی عبارتوں کی نشان دہی ، محتویات کی تفصیل اور ان سے حاصل ہونے والی مستند معلومات نے بھی فہرست ساز کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔ اس سے ایک قدم آگے یہ موضوع بھی اہم ہو گیا کہ زیر نظر نسخوں کے بارے میں ان اطلاعات کو بھی فراہم کیا جائے کہ دوسرے کتاب خانوں میں ان کتب کے کون کون سے دوسرے نسخے پائے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ قلمی نسخوں کی شجرہ بندی اور نظام کتاب داری کے مطابق ان کی ترتیب اور نمبر شمار بھی اہم ہو گئے ۔ اس طرح کی فہرستوں

میں یورپ کے جن محققین نے نام پیدا کیا ۔ ان میں براؤن ، آربری ، ایتھے ، بلوم ہارٹ اور بلوشے کے نام آج بھی احترام سے لیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح کتاب خانہ برلن کے فہرست نگار کو کلاسیکی مقام حاصل ہے ۔ شخصی کتاب خانوں کی فہرستوں میں گارسیں دتاسی اور بعض دوسرے فضلا کے کارنامے آج بھی اس فن کا سرمایۂ خاص ہیں ۔ برصغیر میں مشرقی کتاب خانوں کی فہارس میں ایوانو نے شہرت پائی اور اپنی علمی فضیلت کی دھاک بٹھا دی ۔ اس فن نے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک اور نہج بھی اختیار کی ۔ کتابیاتی فہرست سازی میں کسی ایک کتاب خانے کی جگہ جملہ کتاب خانوں کی معلومات کو یک جا کرنے کا احساس پیدا ہوا ۔ چنانچہ عربی ذخیرہ معلومات کے سلسلے میں بروکلمان کی کئی جلدوں میں تصنیف (Geschichte Der Arabischen Litterature) آج بھی کتاب حوالہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے[1] ۔ اسی طرح فارسی کے خطی نسخوں کے بارے میں سٹوری کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں[2] ۔ اگرچہ اس کے انتقال کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا ، تاہم اس کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری جز میں طب ، طلسم ، علم نجوم وغیرہ مکمل ہو گئے تھے ۔ انتقال کے بعد شائع ہونے والے آخری اجزا پر مشتمل کتابچہ نا مکمل اور مختصر ہے ۔ فن انشا اور فارسی شاعری سے متعلق حصہ اب بھی کسی مردِ میدان کا 'متلاشی' ہے ۔ لیکن جتنا کام ہو گیا ہے وہ تحقیق کے لیے صحت معلومات اور وسعت علم کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ ایران میں قلمی نسخوں کی ایک سے زیادہ فہرستیں موجود ہیں ۔ لیکن آر سی ڈی کی طرف سے احمد منزوی کی نشر کردہ فہرست ، ایک دوسرے زاویے سے اہم ہے کہ اس میں جملہ کتاب خانوں کی فہارس کی بنیاد پر مختصر معلومات کو یک جا کر کے پورے ذخیرے کو اپنے دامن میں سمیٹا گیا ہے[3] ۔ ایرانی فضلا میں سے

۱ ۔ اس پر گراں قدر اضافہ پروفیسر فواد سزگین نے کیے ۔

۲ ۔ برگل نے اس کتاب کا روسی زبان میں ترجمہ کیا اور بہت سے نئے نسخوں کی نشان دہی بھی کی ۔

۳ ۔ آقای منزوی نے پاک و ہند کے مخطوطات کی یک جا فہرستیں بھی کئی جلدوں میں ترتیب دی ہیں اور اسلام آباد سے اس کی چھ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ۔

آقای ایرج افشار خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ انھوں نے فہرست سازی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور فہارس کی کتابیاتی فہرستیں بھی شائع کی ہیں - کتاب شناسی اور 'فہرست ہائی نسخہ ہائی خطی فارسی' کام کی چیز ہے - اس میں ۲۳۳ فہارس کی فہرست ہے اور اس صنف خاص نے ہمارے دائرہ معلومات کو مزید وسعت دی ہے -

(۲)

برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ اس نوع کا کام زیادہ نہیں ہوا اور دائرہ کار کتاب خانوں کی الگ الگ فہرستوں تک ہی محدود رہا ہے تاہم عربی، فارسی اور اردو کے سلسلے میں بعض صاحب اختصاص اور نام آور شخصیتیں ہو گزری ہیں - مرحومین میں مولانا عبدالمقتدر اور عبدالقادر سرفراز کے نام آج بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں - دور حاضر کے محققین میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا امتیاز علی عرشی کے نام مشرق و مغرب میں احترام سے لیے جاتے ہیں - ان کی تیار کردہ فہارس کتب حوالہ میں نمایاں مقام رکھتی ہیں - قریب العہد فہرست سازوں میں افسر امروہوی، عبدالنبی کوکب، ڈاکٹر محمد بشیر حسین عارف نوشاہی اور مشفق خواجہ کے کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں - مشفق خواجہ نے اپنے آپ کو اردو مخطوطات تک محدود رکھا ہے، چنانچہ جائزہ مخطوطات کا اردو کا منصوبہ جو دس جلدوں (اب چھ جلدوں) پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے - جس میں مصنفین کے حالات کے حصے کو خاص اہمیت دی گئی ہے - اس کے لیے جملہ کتاب خانوں کے قلمی نسخوں کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا بطور خاص بھی اہتمام کیا کہ کتاب کے مطبوعہ، منحصر بفرد اور نادر ہونے کے بارے میں بھی الگ عنوان کے تحت مستند معلومات دے دی جائیں - کتابیات کا فن اس دور میں جن حدود کو چھو رہا ہے اس کے بارے میں مستقبل کا محقق ہی صحیح رائے قائم کر سکے گا، لیکن ان مختصر معلومات کی بنا پر جو دائرہ خاص میں آج ہمیں حاصل ہیں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف خاص میں پاکستانی محققین بھی دوسرے ممالک سے کسی طور پر پیچھے نہیں رہے -

(۳)

لاہور کے قلمی خزائن کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کی تھی ۔ چنانچہ اوریئنٹل کالج میگزین میں خزائن مخطوطات کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین قسط وار جاری کیا ، گیا جس میں پنجاب یونیورسٹی کے قلمی مخطوطات کی مجمل فہرست پیش ہوئی ، پھر مفصل فہرست پر کام شروع کیا گیا ۔ فارسی کے قلمی مخطوطات سے آغاز کار کرتے ہوئے اول تاریخ اور پھر فارسی شاعری کے بارے میں دو جلدیں شائع کیں ۔ اس کے بعد اس کام کی تکمیل کا بیڑا مرحوم عبدالنبی کوکب نے اٹھایا ۔ یہ منصوبہ دو الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا ؛ طے پایا کہ اول جملہ قلمی نسخوں کی مجمل فہرست شائع ہو ، عربی سے آغاز کیا گیا ۔ عربی کی مجمل فہرست پریس میں تھی کہ کوکب صاحب ایک حادثے میں انتقال کر گئے ۔ دوسرا منصوبہ عربی فارسی اور اردو کی منتخب کتابوں کے مفصل تذکرے پر مشتمل تھا ۔ عربی کے اہم ترین مخطوطات کی پہلی جلد مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئی (فہرست مفصل جلد اول) اس سے الگ ذخیرہ شیرانی کی مجمل فہرست ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے شروع کی اور اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں ۔ چوتھی جلد ابھی تک منصہ شہود پر نہیں آ سکی ۔ ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے اس کے علاوہ مفصل فہرست سازی کا کام بھی جاری رکھا تھا ؛ چنانچہ مرحوم پروفیسر محمد شفیع کے ذاتی ذخیرے کا جائزہ لیا گیا اور مرحوم کے فرزند کی تحویل میں جملہ قلمی کتابوں کی فہرست تیار کی ۔ اسے پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا ۔ یونیورسٹی کے علاوہ لاہور میں دوسرا اہم ذخیرہ پنجاب پبلک لائبریری میں تھا جس کی مفصل فہرست سازی پروفیسر منظور احسن عباسی نے کی ۔ اگرچہ کتب حوالہ کی عدم دستیابی کی بنا پر اس کام کا وہ معیار تو قائم نہ رہ سکا جس کی توقع تھی ، تاہم اپنی حدود میں یہ کام بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ۔

لاہور کے ذاتی کتاب خانوں میں جو نوادر محفوظ ہیں وہ ابھی تک محتاج تعارف ہیں ۔ اس نوع کے کاموں میں تہران یونیورسٹی کی بعض طالبات نے کچھ کام کیا ۔ چنانچہ کتب تصوف کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز اور نجی کتاب خانوں کے نادر مخطوطات کے لیے ڈاکٹر خالدہ اصغر کے مقالے

بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن افسوس یہ دونوں مقالے ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے۔

(۴)

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری تقسیم برصغیر سے قبل مطبوعات اور جرائد کے لیے اہم شمار کی جاتی تھی ، خصوصاً انگریزی مطبوعات کے وافر ذخائر کی وجہ سے اسے ایشیا کی چند اہم لائبریریوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ حصول پاکستان کے چند برس بعد تک یہ لائبریری کئی حادثوں کا شکار ہوئی اور اس کے کئی اہم سیکشن دست برد زمانہ کے شکار ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء کے آخر میں متروکہ وقف املاک بورڈ میں راقم کو کم و بیش ایک برس گزارنے کا موقع ملا تو اس لائبریری کی دیکھ بھال بھی شروع کی گئی - چنانچہ مطبوعات کے علاوہ دو چار بچے کھچے قلمی نسخے بھی ملے جس میں تاریخ پنجاب سے متعلق ایک منحصر بفرد قلمی نسخہ بھی تھا۔ لائبریری کی تنظیم نو کی گئی اور میری نگرانی میں یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ پنجاب یونیورسٹی میں میرے واپس جانے کے بعد لائبریری کے قلمی مخطوطات کی طرف توجہ کی منزل آئی ۔ ریٹائرڈ ڈاکٹر لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کی مساعی سے اس لائبریری میں مخطوطات کی جمع آوری کو اولین اہمیت دی گئی اور چند برس کے اندر ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ کرنل صاحب کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں اس لائبریری میں بعض ذاتی کتب خانے بھی شامل ہوئے اور اس کا شدت سے مطالبہ ہونے لگا کہ مخطوطات کی فہرست بھی شائع کی جائے تا کہ استفادہ ممکن ہو۔

(۵)

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے خزائن مخطوطات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ، جن میں ۲۵۰ قلمی نسخوں کا تذکرہ ہے۔ ان فہارس کی ترتیب و تدوین کے لیے برٹش میوزیم کی فہارس کو بطور نمونہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ کام مولانا محمد متین ہاشمی کی ذاتی محنت کا رہین منت ہے۔ مولانا علوم دینی میں اختصاص رکھتے ہیں ۔ زیر نظر جلد (جلد سوم) میں بھی ان کی دینی معلومات کتاب کا اہم ترین حصہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادبیات کے ذیل میں ان فراہم کردہ معلومات کسی لحاظ سے بھی انگشت نمائی کی زد میں آتی ہیں۔ انھوں نے فہرست کی تیاری میں

صرف ثانوی مآخذ پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ ہر کتاب کے بارے میں قدیم مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے اور قلمی نسخوں کے اندر موجود مواد کو نئے سرے سے چھان پھٹک کر محققین قدیم کے بعض مغالطوں کو بھی دور کیا ۔ اگرچہ لائبریری میں کتب حوالہ کی شدید کمی کی بنا پر بعض دریافت شدہ معلومات تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی ، مثلاً انھوں نے سٹوری سے کئی مقامات پر مدد لی ہے ، لیکن ان کے کارنامے کے آخری دو حصے ان کے سامنے نہ تھے ۔ اس لیے علم نجوم اور طب وغیرہ کے ذیل میں سٹوری سے کوئی استفادہ نہیں ہو سکا ۔ اسی طرح بوہار لائبریری ، باڈلین لائبریری ، کتب خانہ برلین ، ڈھاکہ یونیورسٹی ، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ڈھاکہ ، کتب خانہ رامپور کی مطبوعہ فہرستیں بھی ان کے پیش نظر نہ تھیں ۔ میرے خیال سے حوالہ جاتی کتب کے سلسلے میں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے لیکن ان کوتاہیوں کی تلافی مولانا نے اس طور کر دی ہے کہ خود قلمی نسخوں کے داخلی مواد کو پوری محنت سے استعمال کر لیا ہے اور بڑی کامیابی سے نئی معلومات اضافہ کی ہیں ۔

(۶)

فہرست مخطوطات کی اولین جلدوں میں بعض طباعت اور تدوین کی معمولی غلطیاں بھی تھیں جن کی نشان دہی بعض فضلا نے کی ۔ البتہ اس جلد میں پہلی جلدوں کے مقابلے میں بہتر اور زیادہ مکمل معلومات ہاتھ آئیں گی ۔ مولانا محمد متین ہاشمی اور حافظ غلام حسین کی شبانہ روز محنت سے یہ جلد سابقہ جلدوں سے بازی لے گئی ہے اور بلا خوف تردید اس کے اندراجات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس جلد میں تین طرح کی کتابیں درج ہیں :

اول : ایک بڑا حصہ ان کتابوں پر مشتمل ہے جو برصغیر پاک و ہند میں درسیات میں شامل تھیں ۔ ان میں اکثر نسخے زیادہ قدیم یا اہم نہیں لیکن برصغیر کے نصابی سرمائے کے احصا کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر بھی ہے ۔

دوم : وہ مخطوطات ہیں جن کا تعلق برصغیر پاک و ہند میں خاص طور پر پنجاب ، سندھ اور سرحد کے ساتھ ہے ۔

سوم : وہ مخطوطات ہیں جو مصنف کے خود نوشت یا معاصر یا قریبی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔

دوسری اور تیسری شق کی روشنی میں ذیل میں بعض اہم مخطوطات کی نشان دہی کی جاتی ہے :

۱ - تفسیر حسینی جلد اول ، مخطوطہ نمبر ۶۳۵ ، (تالیف ۹۱۰ھ ، نسخہ مکتوبہ ۹۹۳ھ)۔
۲ - کتاب المعراج ، مخطوطہ ۳۳ ، مصنف غالباً معروف پنجابی شاعر فضل شاہ ۔
۳ - کاید الگنج (کذا) مخطوطہ ۲۳۷ شمس العاشق ، برہان الدین حسینی ۔
۴ - ہدایتہ الاعمی ۔ مخطوطہ ۶۳۹ حسین کاشمیری ، ۱۰۵۷ھ ، مکتوبہ ۱۰۸۶ھ)۔
۵ - انوار غیاثی ، مخطوطہ ۳۲۷ ۔
۶ - اخلاق سروری ، مخطوطہ ۳۸۹ (اردو) کتابت ۱۲۸۳ھ۔
۷ - تضمین نظیر اکبر آبادی بر کریمای سعدی ، مخطوطہ ۱۸۷ (نادر نسخہ)۔
۸ - توضیح حواشی الحسامی ، مخطوطہ ۳۹۹ ، بہاء الدین موہانی کتابت ۱۰۷۳ھ ۔
۹ - شرح نام حق ، مخطوطہ ۶۳۷ ، اختیار بن غیاث الدین م ۹۲۸ نسخہ مکتوبہ ۱۰۸۵ھ ۔
۱۰ - مجموع سلطانی ، مخطوطہ ۶۵ ، دور غزنی کی کتاب ۔
۱۱ - کفایۃ الاعتقاد ، مخطوطہ ۶۳ (ب) ، حکیم محمد حسین کشمیری ۱۰۵۷ھ ۔
۱۲ - چار چمن (چار گلزار ؟) مخطوطہ ۶۶۹ ، ۱۲۷۱ھ ۔
۱۳ - گلزار منت ، مخطوطہ ۶۶۷ ، از عبدالسلام ۔
۱۴ - عرض حال ، مخطوطہ ۳۳۷ ۔
۱۵ - قصہ حسن وعشق ، مخطوطہ ۵۹۰ ، نعمت خان عالی ، مکتوبہ ۱۰۳۶ھ۔
۱۶ - تاریخ مشتمل بر احوال ہند و ملک آن ، مخطوطہ ۳۰ سید احمد شاہ بٹالوی ، مکتوبہ ۱۲۸۳ھ ۔
۱۷ - دستور الفصد ، مخطوطہ ۱۱۷ (پنجابی) ، حکیم دیندار (نادر) ۔
۱۸ - طب احسانی ، مخطوطہ ۶۹۶ (اردو) ، احسان علی فتح پوری ، مکتوبہ ۱۳۱۹ھ ۔
۱۹ - فرس نامہ ، مخطوطہ ۶۷۵ (فارسی) نادر ۔
۲۰ - خوان نعمت ، مخطوطہ ۲۱ (فارسی) ، منحصر بفرد نسخہ ۔

کتابیات تحقیق و تنقید پر ایک نظر

اردو میں کتابیات کی ترتیب کا رجحان کچھ زیادہ قدیم نہیں خصوصی موضوعات پر فہرست سازی تو اور بھی کمیاب ہے - سلیم اختر صاحب نے اردو تنقید اور تحقیق سے متعلق کتب کی فہرست بنانے کا ڈول ڈالا ہے - اگرچہ اردو کی سال بسال کتابیات کی روایت کا آغاز بھارت سے ہو چکا ہے لیکن یہ فہرست اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اردو تنقید اور تحقیق پر شائع ہونے والی صرف ان کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان پاکستان میں شائع ہوئیں - خصوصی موضوعات پر شائع ہونے والی کتابیات میں ہر چند کہ غالب کے سلسلے میں طبع ہونے والی کتابیات کو اولیت حاصل ہے لیکن یہ فہرست اس لحاظ سے زیادہ وقیع ہے کہ اس کے موضوعات کا دائرہ ادب کے ان "رقبوں" سے تعلق رکھتا ہے ، جو اردو ادب کے لیے بے منزلہ اساس ہیں -

اردو تنقید میں ظہور پاکستان کے بعد سے فکر و نظر کے جو مختلف دبستان وجود میں آئے ان کی نشان دہی اس کتابیات سے بخوبی ہوتی ہے - اس کے علاوہ ہماری تنقید جس بحران ، عدم توازن اور خلفشار کا شکار رہی اس کی تصویر بھی اس آئینے میں ملتی ہے - اس طرح ایک قاری اس کتابیات کی مدد سے اپنے مطلب کا مال ہی تلاش نہیں کر سکتا ، بلکہ اسے اردو تنقید کے پورے مد و جزر کا اندازہ ہو سکتا ہے - اس لحاظ سے یہ کتابیات اردو میں تنقید کے ماضی ، حال اور آئندہ کے امکانات کا اشاریہ بھی ہے اور تاریخ ادب کا طالب علم اس کی مدد سے اردو تنقید کی روایت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے واقف ہو سکتا ہے -

اردو تحقیق کے بارے میں پاکستان میں کیا کچھ ہوا ؟ اور اس کام کی رفتار اور مقدار کیا رہی ؟ اس کی تفصیل بھی کتابیات میں پائی جاتی ہے

تحقیق ایک صبر آزما ، خشک اور بظاہر غیر تخلیقی عمل سمجھا جاتا ہے ، سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک مدت سے تحقیق اور تنقید کے دھارے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے ہیں - تخلیقی فن کار تحقیق کی مشقت اور محنت سے خائف ہے اور اسے ایک خاص طرح کی معاندانہ سرگرمی سے وابستہ کرتا ہے - اس عصبیت سے قطع نظر محقق کا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ وہ تخلیقی فنکار کی طرح خام مواد سے تشکیل حسن کرتا ہے - وہ تو ادب کے طالب علم کو 'کچا مال' دیتا ہے ، اب یہ ادیب اور نقاد کا کام ہے کہ اس سرمائے کو تنقیدی بصیرت کا حصہ بنائے اور محقق کے حق میں دعائے خیر کرے ، اگر محقق کی یہ بات خامی ہے کہ وہ جز کی مدد سے کل نہیں بناتا تو یہ اردو نقادکی خامی بھی ہے کہ وہ "پا در ہوا" اور "بے سروپا" مواد کے سہارے تنقید کے قلعے تعمیر کرتا رہا - تحقیق سے کنارہ کشی کے سبب اردو تنقید ایک مدت سے آخلا میں سفر کر رہی ہے اس کی جڑیں اردو ادب میں پیوست نہیں - ضرورت ہے کہ تحقیق اور تنقید کے درمیانی فاصلے کم کیے جائیں اور محقق اور نقاد دونوں اپنے اپنے کارناموں کو ایک دوسرے کی محنت اور بصیرت کی مدد سے استوار کریں - یہ کتابیات اسی اشتراک عمل کا اظہار ہے - اس کے صفحات میں تنقید و تحقیق کی یک جائی کو مستحسن اقدام تصور کرنا چاہیے -

اردو تنقید و تحقیق کی یہ کتابیات (مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر) اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں لائبریری سائنس کے اصولوں کو پہلی بار کتاب کے تاروپود میں پوری دیانتداری کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے - سلیم اختر صاحب ادیب ہی نہیں لائبریری سائنس پر بھی عبور رکھتے ہیں ان کی کتابیات نیشنل بک سنٹر کی پرانی کتابی فہرستوں کے مقابلے میں زیادہ سائنٹیفک ہے - اب ایک عام قاری اور پختہ کار ادیب دونوں اس سے بخوبی کام لے سکتے ہیں -

عام طور پر کتابیات کی ناکامی یہ ہوتی ہے کہ فہرست ساز اسے امکانی حد تک مکمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے - کسی ایک لائبریری کو بنیاد بنا کر کام پورا کیا جاتا ہے - جو کتابیں اس لائبریری میں نہ ہوں فہرست سے رہ جاتی ہیں - اس طرح کی "ڈنگ ٹپاؤ" اور نامکمل فہرست اپنی افادیت کھو دیتی ہے - سلیم اختر کو اس کا پورا احساس ہے

کہ انہوں نے اپنی فہرست کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور جامع بنانے کی کوشش کی ہے ۔ تکمیل میں حرف آخر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا اور یہ دعویٰ سلیم اختر کو بھی نہیں ، لیکن جہاں تک میں اس کتابیات کو پرکھ سکا ہوں ، پاکستان میں شائع ہونے والی کوئی اہم کتاب سلیم اختر کی زد سے بچ نہیں سکی ۔ کتابیات سازی کے صبر آزما عمل میں یہی مرحلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور یہیں بے صبر اور مضطرب کتابیات ساز اپنے پورے کام کی وقعت اور قدر برباد کر لیتا ہے ۔ سلیم اختر نے اردو کتابیات سازی کی روایت کو سائنٹیفک بھی بنا دیا اور امکانی حد تک اس کی تکمیل کا اہتمام بھی کیا ہے ۔ ضرورت ہے کہ ادب کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق کتابیات بھی اس فہرست کے بعد شائع کی جائیں ۔ محققوں اور نقادوں کے بعد ادب اور علم کی دیگر اصناف بھی نیشنل بک سنٹر سے تقاضا کرتی ہیں کہ کتابیات کی جملہ فہارس کو ایک ہی سائنٹیفک سانچے میں ڈھال دیا جائے ۔ پرانی فہرستیں نظرثانی کی محتاج ہیں ۔ سائنٹیفک طریق کار سے اگر ان قدیم فہرستوں کی بھی نظرثانی ہو جائے اور انہیں مکمل اور جامع بنا دیا جائے تو یہ علم و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی ۔

کتاب نامۂ شبلی

(۱)

کتاب نامۂ شبلی ، جناب اختر راہی نے ترتیب دیا ہے اور اسے مسلم اکیڈمی ، محمد نگر ، علامہ اقبال روڈ لاہور نے بہ تعاون بزم ادب ِشبلی کالج لاہور سے شائع کیا ہے ۔ تاریخ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء ہے ۔ ۶۴ صفحات کا یہ کتابچہ علامہ شبلی کے بارے میں کتابیات پر مشتمل ہے ۔ اس موضوع پر اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں کچھ کام ہوا تھا ۔ اختر راہی صاحب نے ان تینوں فہرست سے بھی کام لیا ہے اور اپنی طرف سے بہت سے اضافے بھی کیے ہیں جس سے اس موضوع پر اب تک شائع ہونے والی فہارس سے یہ مجموعہ سب سے زیادہ مکمل ہے اور معلومات کے لحاظ سے مفصل ہے ۔

آغاز کتاب میں ایک پیش لفظ از حافظ نذر احمد ، ایک ابتدائیہ بقلم مرتب شامل ہے جن میں سابقہ فہارس کے بارے میں بحث ہے ۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ، حصہ اول تصانیف شبلی ، مرتبات ، ملخصات ، تراجم (بشمول انگریزی تراجم) کے اندراجات پیش کرتا ہے ، دوسرے حصے میں علامہ شبلی پر کتابیں اور مقالات ہیں ۔ فاضل مرتب کی نظر سے جو کتابیں اور مقالے گزرے ہیں اُن کے کوائف بقید سنین و صفحات دیے ہیں ۔ جن کا مآخذ پہلے کی شائع شدہ فہارس میں نہیں ان کا حوالہ جس طور سے بدون تفصیل ان مصادر میں درج تھا آ سے من و عن لے لیا گیا ہے ۔

ضرورت ہے کہ اسی طرز پر حالی ، سرسید اور دوسرے اکابر کی کتابیات بھی ، شائع کی جائیں یہ کام راہی صاحب کے کرنے کا ہے ، امید ہے کہ زیر نظر کتاب نامہ شبلی دوسری کتابیات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔ اب تک یا تو علامہ اقبال اور غالب خوش قسمت رہے ہیں جن پر ایک سے زائد کتابیات دستیاب ہیں یا پھر وہ چند مصنفین بھی ہیں جن کی کتابیات رسائل میں کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہیں ، مثلاً فانی ، جگر مرادآبادی ، اصغر گونڈوی وغیرہ ۔ محققین کے لیے ان کتابیات کی اہمیت مسلم ہے اس لیے

جب کوئی اس طرح کی فہرست شائع ہوتی ہے تو محققین بجا طور پر خوش آمدید کہتے ہیں -

کتاب نامہ شبلی ایک بڑی حد تک جامع فہرست ہے لیکن کہیں کہیں طریق کار کے اعتبار سے اور مواد کے لحاظ سے بھی ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ، مثلاً بعض مقامات پر کراس ریفرنس کا اندراج مفید ہوتا - صفحہ ۱۱ پر شعرالعجم کی چار جلدوں کے بعد پانچویں کے لیے صفحہ ۱۷ کا حوالہ ضروری تھا - صفحہ ۱۸ پر شعرالعجم حصہ پنجم کا اندراج دوبارہ ہوگیا ہے اور اس سے پہلے صفحہ ۱۷ پر درج ہے ، یہاں سے حذف ہونا چاہیے - صفحہ ۱۹ پر مشتاق حسین کی باقیات شبلی کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری تھی کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھارت سے شائع ہوچکا ہے - صفحہ ۲۰ پر ملخصات کے تحت شعرالعجم کی پانچوں جلدوں کے وہ خلاصے بھی شامل کرنے تھے جو شیخ مبارک علی نے لاہور سے چھاپے تھے - صفحہ ۲۱ پر فارسی تراجم کے تحت ترجمہ رسالہ بدرالاسلام درج ہے ، یہی نام صفحہ ۲۰ پر بدءالاسلام کے طور پر درج ہے - ایک ہی کتاب کا نام بھی ایک ہی ہوگا ، غالباً طباعت کی غلطی ہے - نیز فارسی ترجمے کے مصنف عبدالحمید نہیں ، مولانا حمیدالدین فراہی ہیں - (رک : برائے تفصیل مجلہ فکر و نظر اسلام آباد) - صفحہ ۲۷ پر محمد امین زبیری کی کتاب ذکر شبلی کے بارے میں یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ کتاب مصنف کی مفصل کتاب کا خلاصہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی - اسی طرح "شبلی کی زندگی ایک رنگین ورق" بھی دوسری بار برق اینڈ کمپنی لاہور سے شائع ہوئی - صفحہ ۲۸ پر تنقید شعرالعجم کے بارے میں بھی یہ لکھنا ضروری تھا کہ یہ سلسلہ مضامین کے طور پر اول رسالہ اردو میں شائع ہوئے - صفحہ ۳۰ پر ابن فرید کے مقالات کے بارے میں یہ بتانا بھی اہم ہے کہ یہ مقالے ابن فرید کی کتاب "میں ، ہم اور ادب" میں شامل ہیں - صفحہ ۵۶ اور ۵۷ پر دو نام غلط درج ہوئے ہیں ، نام محمد معین الدین دردائی ہے نہ کہ محمد حسین الدین دردائی ، اسی طرح صحیح نام محمد شریف بلال ہے نہ کہ محمد شریف ہلال - صفحہ ۶۲ میرے دو مقالوں کا ذکر ہے ان میں تیسرا مقالہ بھی شامل ہو سکتا ہے جس کا عنوان 'تنقید شعرالعجم پر ایک نظر' تھا اور رسالہ 'کتاب' لاہور کے جون ۱۹۶۵ء ،

کے شمارے میں شائع ہوا تھا - اس میں شبلی کی شعرالعجم کی کچھ مزید غلطیوں کی نشان دہی بھی کی گئی تھی -

ان کے علاوہ بعض اور حوالے بھی اضافہ ہوسکتے ہیں ، مثلاً حسن مثنی بن یحییٰ تنہا کا مقالہ علامہ شبلی کی فارسی شاعری در روداد دائرۂ معارف اسلامیہ جلد اول ، تاریخ ادب اردو مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد ، یحییٰ تنہا کی مراۃالشعراء نیز تاجور نجیب آبادی مرحوم کے 'تنقیدی مضامین' میں بھی شبلی کا تفصیلی جائزہ درج ہے - انگریزی کتب میں ڈاکٹر محمد صادق کی The Twentieth Century Urdu Literature جو بمبئی سے ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی - اسی طرح موہن سنگھ دیوانہ کی کتاب Modern Urdu Poetry میں بھی شبلی پر تفصیل سے لکھا گیا ہے - انگریزی حصے میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق کا نام ڈاکٹر صادق حسین درج ہوگیا ہے - ان سب باتوں سے قطع نظر کتاب نامہ شبلی اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے -

---

فن تاریخ گوئی

(۱)

فن تاریخ گوئی پر کپٹن منظور حسن کی کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اس میں انھوں نے ایک ایسے علم کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے ، جس کے قدردان اب خال خال ملتے ہیں ۔ حساب الجمل حروف کے بامعنی مرکبات کی عددی قیمتوں کو محفوظ کرنے کا طریق کار ہے ۔ اس کا سرا ازمنہ قدیم کے مذہبی و نیم مذہبی اعتقادات میں پیوست ہے۔ بعض اعداد با برکت یا مقدس اور بعض منحوس اور غیر پاکیزہ تصور کیے جاتے رہے ۔ مختلف اقوام و ملل میں اعداد کی جفت یا مفرد حیثیتوں کو خیر و برکت یا نحوست و ادبار سے مختص کیا جاتا تھا ۔ نو (۹) اور سات (۷) کے اعداد نے بعض ادیان و اقوام میں بڑی اہمیت حاصل کی ۔ قسمت کا حال افعال انسانی کے نتائج کے بارے میں پیش گوئی ، مستقبل کی بشارت ، یہ سب اعداد کے طلسمی اثرات کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اقرار تھا ۔ اسی احساس کے بطن سے علم جفر اور علم نجوم نے جنم لیا ، گویا اعداد کا عمل دخل انسانی زندگی کے مظاہر میں قرن ہا قرن سے ناگزیر ہے ۔

تحفظِ حیات کا جذبہ جہاں مذہبی اور نیم مذہبی واردات کے حصول کا سرچشمہ رہا ہے ، وہاں دنیاداری کی سطح پر زندگی کے نقوش محفوظ و مصئون رکھنے میں انسانی مساعی کے لیے فن تاریخ کتبہ نگاری، فن تاریخ گوئی اور ایسے ہی دوسرے علوم نے اہم خدمت انجام دی ہے ۔ فنِ تاریخ گوئی بقا کا ایک موثر ذریعہ ہے ، جس کی مدد سے گذشتہ واقعات کی یاد محفوظ رکھی جاتی ہے ۔ اعداد اپنی طلسمی فضا سے نکل کر انسانی زندگی کے مادی پہلوؤں کے تحفظ کا وسیلہ بن جاتے ہیں ۔ مسلمانوں کے ہاں ملت کے دوام کا مؤثر وسیلہ تاریخ کا فن رہا ہے ۔ اس لحاظ سے علم التاریخ نے ہمیشہ ملی تشخص اور ملی عزائم کی آب یاری کا فریضہ ادا کیا ہے ۔ ماضی حال سے اور حال مستقبل کے ساتھ پیوست ہے ، اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ہیئت

اجتماعیہ انسانیہ کی ترقی کا راز ماضی کے ادراک و شعور کے بغیر ممکن نہیں اس لیے فن تاریخ کے مختلف شعبے مسلمانان عالم کے خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ حساب الجمل بھی تاریخ کا ایک اہم پہلو تھا جسے مسلمان مؤرخین اور شعراء نے جامع فن کی حیثیت سے اختیار کیا ۔ اس سے عمارات کے سنین تعمیر کی دریافت ، اہم واقعات کے مادہ ہائے تاریخ ، افراد کی پیدائش و وفات کے مواقع اور کتب و رسائل کے سال ہائے تصانیف کا حتمی بیان ممکن ہوا ۔ عربوں نے اس فن لطیف کی زیادہ قدر افزائی نہیں کی لیکن ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نے ترقی کی بہت سی منازل طے کی ہیں ۔

(۲)

حروف ابجد کی عددی قیمتوں کے دو بڑے نظام رائج رہے ۔ ایران و ہند اور گرد و پیش کے علاقوں میں حروف ابجد کی قیمتوں کا سلسلہ ایک سے دس ، دس سے سو اور سو سے ہزار تک مقبول ہے ۔ لیکن بلاد الغرب (المغرب) میں ص = ۶۰ ض = ۹۰ س = ۳۰۰ ظ = ۸۰۰ غ = ۹۰۰ ش = ۱۰۰۰ ب = ۲ ف = ۳ ج = ۴۰۰ د = ۴ ر = ۲۰۰ ز = ۷ ک = ۲۰ کے حساب سے حروف کی قیمتیں معین ہوئیں ۔ ان دونوں نظاموں میں اول الذکر طریق کار زیادہ مقبول تھا ۔ مسلمانوں کا بیشتر سرمایہ اسی انداز تاریخ گوئی کا مرہون منت ہے ۔

(۳)

ایران میں ادب فارسی کے آغاز سے اس نوع کی تاریخ گوئی کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے بعد سے تاریخ گوئی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا ، تا آنکہ ایل خانی دور اور تیموری ادوار میں اس کی اہمیت فن تعمیر کے توسط سے شعراء کی نظر میں بڑھ گئی ۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں :

"حضرت نظامی علیہ الرحمہ" کے زمانے سے پیشتر شعراء کے کلام میں تاریخوں کا پتہ کہیں نہیں چلتا ۔ زیادہ فروغ اس کو حضرت جامی کے زمانہ میں ہوا ہے۔ ان کے بعد بہت سے شعراء نے اپنے

کلام میں قواعد منضبط کیے ۔ جس کے بعد پھر ان میں کوئی ترمیم و تغیر و تبدل نہیں ہوا ۔"[1]

فن تعمیر کے ذوقِ فراواں نے تاریخ گوئی کے فن کو شہرت دی ۔ اس طرح دسویں صدی ہجری تک مشرقی ممالک میں اس علم کا خاصہ چرچا ہو گیا ۔

بلاد المغرب میں فن لطیف کی مقبولیت کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری سے جاننا چاہیے :

"مراکش میں گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں خانوادۂ بنو سعد کے عہد حکومت کے دوران میں کہیں جا کر نہ صرف تاریخی یادگاروں کے کتبات میں بلکہ وفیات میں تاریخی مادوں کا استعمال عام ہوا ۔ مراکش کے مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے تاریخی مادوں والی منظوم وفیات کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا ۔"[2]

برصغیر پاک و ہند میں اس فن کا نقطۂ عروج دور ہمایوں سے شروع ہوتا ہے ۔ اس سے قبل کتبوں میں اس کا رواج ضرور تھا ، لیکن ہمایوں کے زمانے میں تاریخ گوئی ، لغز و معما اور چیستان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تو اس فن کو بھی مقبولیت کے پر لگ گئے ۔ آل تیموری کے ہاں اس کا ذخیرہ وافر پایا جاتا ہے ۔ اکبر ، جہانگیر ، شاہجہان ، اورنگ زیب کے زمانے میں اس صنف کو بہت ترقی ہوئی اور عمارتوں کے کتبے نیز تاریخی کتب میں واقعات کے بارے میں قطعات تاریخ بکثرت رقم ہوئے ۔

(۴)

تاریخ گوئی کی کئی قسمیں ہیں ۔ ان میں صوری تاریخ گوئی کا رواج زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے ۔ اہل خاں دور کے بعد حساب جمل میں کئی طرح کی باریکیاں بھی پیدا ہوئیں اور گونا گوں اضافے بھی ہوئے ۔ ذوقِ ریاضی نے اعداد کے کئی جوڑے تخلیق کیے اور قسم کی موشگافیاں اس فن

۱ ۔ تاریخ خزانہ فیروز الدین ص ۶ ۔

۲ ۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ہشتم ص ۱۷۶ ۔

سے خاص ہو گئیں اور (i) صوری کے علاوہ (ii) معنوی اور پھر (iii) صوری و معنوی تاریخوں کے سلسلے چل نکلے ۔

اس کے علاوہ معنوی اور صوری و معنوی کی مختلف حالتیں مثلاً سالم الاعداد (مطلق تاریخ) ناقص الاعداد (تعمیہ) زائد الاعداد (تخرجہ) بیان ہونے لگیں ۔ ان مختلف النوع کمالات کے علاوہ صنعت توشیح ، زبر ، بینات اور زبر و بینات وغیرہ کے قاعدوں میں آ کر یہ فن کئی منزلیں طے کر گیا ۔ اس فن کے اصول و قواعد مختلف النوع ضابطوں کے پابند ہو گئے ۔

(۵)

فن تاریخ گوئی ایک مشکل اور پیچیدہ نظام ہے ۔ اس پر فارسی میں کتب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ اردو کا دامن بظاہر اس سے خالی ہے ، تاہم برصغیر پاک و ہند میں تیرھویں صدی میں بعض کتابیں تحریر میں آئیں جن میں چند ایک اردو میں ہیں ۔ اس فن کی کتابوں کی تدوین کا سبب شاید یہ ہے کہ برصغیر کی معاشرت میں زندگی کی جگہ آرٹ نے لے لی تھی ۔ الفاظ کو مواد پر فوقیت حاصل ہو گئی تھی ، شعراء جذبات کی جگہ، زبان اور احساسات کی جگہ لغت مرتب کرنے لگے تھے ۔ مظہر العجائب (مناسبات شعری) سراپا سخن (تذکرہ) اس رجحان کو ظاہر کرتے ہیں ۔ لغت کی کتابیں اس پر مستزاد ہیں ۔ ایسے میں تاریخ گوئی کے فن کو منضبط کر کے اسے ریاضی کی شاخ بنا دینے کا خیال شدت اختیار کر گیا ۔ چنانچہ جلال و تسلیم کے ہاں یہی رجحان غالب ہے ۔ اس دور کی کتب کی ایک مختصر سی جھلک بے موقع نہ ہوگی :

۱ - مفتاح التواریخ ، طامس بیل ۱۲٦۳ھ
۲ - گنج تاریخ - مفتی غلام سرور لاہوری ۱۲۸۳ھ
۳ - مقیاس الاشعار - محمد جعفر اوج ۱۲۹۲ھ
۴ - افادۂ تاریخ - جلال لکھنوی
۵ - ملخص تسلیم - تسلیم سہسوانی ۱۳۰۳/۱۳۰۲ھ
٦ - عدد التاریخ - تسلیم سہسوانی ۱۳۲۰ھ (تاریخ اشاعت)
۷ - گلبن تاریخ - الم ۱۳۱۳ھ

ان کی درجہ بندی کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اول ایسی کتب کی کثرت ہے جن میں منظوم تاریخیں یکجا کی ہیں (مفتاح التواریخ ، گنج التواریخ)۔ دوم وہ کتب ہیں جن میں مادہ ہائے تاریخ کو لغت کے انداز میں یکجا کیا گیا ہے (عدد التاریخ) ، سوم فن تاریخ گوئی کو مرتب کیا گیا ہے (ملخص تسلیم ، گلبن تاریخ)۔ ان میں اول اور ثالث کی اہمیت دوم کے مقابلے میں زیادہ ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے موقع نہیں کہ علم کی فنی باریکیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی ۔ ان کتب میں فن تاریخ گوئی کے بارے میں اجتہاد فکر کا سراغ نہیں ملتا ۔ قدیم سے رائج قوانین ہی کو مرتب کر دیا گیا ہے ۔ لکھنے والوں کی جدت طرازی کسی نئی جہت یا فکر و فن کی نئی راہ کی خبر نہیں دیتی ۔ ملخص تسلیم کو دوسری کتب پر فوقیت ہے کہ اس سے فن کو جاری رہنے میں مدد ملی ۔ ورنہ اس دور کا نمایاں پہلو تو فقط لغت کے انداز پر قدیم تاریخی نمونوں کو پیش کرنے پر منحصر ہے ۔ بیل اور مفتی غلام سرور کے علاوہ خود تسلیم نے عدد التاریخ میں اس طرز کی نمائندگی کی ہے ۔ علم تاریخ گوئی پر ملخص اور گلبن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا حلقہ محدود ہے کیونکہ یہ شہرت صرف خواص کے حلقے میں تھی عوام اس فن سے نابلد تھے ۔ مدت تک ملخص تسلیم اس فن کا عمدہ نمونہ مانی گئی ۔ افغانستان میں البتہ گلبن تاریخ کو حلقۂ خواص میں شہرت نصیب ہوئی ۔ محمد ابراہیم خلیل الاحمد الجامی نے گلبن تاریخ کو "استخراج تاریخ در نظم" کے عنوان سے ۱۳۳۷ھ ش میں ترجمہ کر کے انجمن تاریخ کے سلسلۂ اشاعت میں چھاپ دیا ۔ خلیل نے کہیں کہیں اپنی طرف سے بعض مثالوں کا اضافہ بھی کیا ہے لیکن جیسا کہ دیباچے میں اس نے اعتراف کیا ہے ۔ بنیادی مطالب گلبن تاریخ ہی سے لیے گئے ہیں ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملخص فارسی میں ہے اور اس کی شہرت پاک و ہند میں رہی اور گلبن اردو میں تحریر ہونے کے باوجود افغان ادباء کی قدردانی کا سرمایۂ خاص ہو گئی ۔ تدوین کی یہ مساعی فقط ایک ختم ہوتے ہوئے فن کو زندہ رکھنے کی آخری کوششیں تھیں کیونکہ اس کے بعد سے فن تاریخ گوئی پر کسی قابل ذکر کتاب کا حوالہ نہیں ملتا ۔ یہ تسلیم کرنا غلط نہ ہوگا کہ تسلیم سہسوانی کے بعد تاریخ گوئی کی مقبولیت ماند پڑنے لگی ۔ کسی ادیب کو اگر کبھی

اس کی ضرورت پڑی تو اس کا سبب کسی واقعہ کو منضبط کرنا یا اس فن کے حصول کا جذبہ نہ تھا ، بلکہ تاریخی ناموں کے کسی قدر رواج نے لوگوں کو ادھر متوجہ رکھا ۔ فن سے واقفیت کم سے کم ہوتی چلی گئی اور لوگوں کو تاریخی ناموں کی تلاش کے لیے بنے بنائے مواد کی جستجو ہوئی ۔ اس دور میں صرف دو کتابیں دستیاب ہیں ان میں فن کی تفصیلات اور احوال و ضوابط کا بیان موضوع خاص ہی نہیں بلکہ انھیں ایک لحاظ سے تاریخی ناموں کا چارٹ قرار دینا چاہیے ۔ عدد التاریخ کے نمونے پر ادباء نے اعداد ملفوظی کو یک جا کر کے قارئین کے لیے آسانی فراہم کی اور دو کتابیں شائع ہوئیں :

(۱) تاریخی خزانہ یعنی چودھویں صدی کے تاریخی نام :

اس میں تین ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کے تاریخی نام بحساب ابجد ۱۳۲۶ھ سے لے کر ۱۳۰۰ ہجری تک علیحدہ علیحدہ سال بسال درج ہیں۔ مصنف حافظ فیروز الدین ککے زئی ، مطبوعہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۸ء ۔

(۲) معین الادب معروف بہ معین الشعراء :

یہ اردو زبان کے مروجہ الفاظ کا لغت ہے جس میں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی بقید امثال از کلام شعراء درج ہیں ۔ مصنف غلام حسین آفاق بنارسی شاگرد امیر مینائی ، ناشر صدیق بک ڈپو ۔ ۱۳۵۲ھ ۔

(۶)

بیسویں صدی کے اوائل سے خواص کی توجہ بھی تاریخ گوئی سے ہٹ گئی جو ریاضت اور لگن اس کے لیے درکار تھی ، عام زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی بنا پر نیز مادی فوائد کی تلاش و جستجو نے لوگوں کو دوسرے راستے پر لگا دیا اور اس لطیف فن کے جاننے والے بھی خال خال رہ گئے ۔ ایسے میں کیپٹن منظور صاحب کو جتنی داد بھی دی جائے کم ہے ۔

زیر نظر کتاب کے تین حصے ہیں - پہلے حصے میں فن کے دیگر علوم سے مصنوعی روابط نیز حروف تہجی کے تغیرات سے بحث ہے ، دوسرے میں فن کی اقسام بیان ہوئی ہیں ، تیسرے حصے میں تاریخ گوئی کے سلسلے کے بعض ضروری مباحث ہیں - الف ممدودہ ، تائے مثناۃ فوقانی ، کاف بیانیہ ، یائے تحتانی وغیرہ کی اعداد شماری میں ماہرین فن میں اختلاف رہا ہے - کپتان صاحب نے مختلف الخیال اشخاص کے مسلک بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان نازک مباحث پر کھل کر اظہار خیال بھی کیا ہے اور اپنے مسلک کے جواز میں دلائل بھی دیے ہیں - اس طرح ان کی کتاب مطالب علمی کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہو گئی ہے -

کپتان صاحب نے تاریخ گوئی کے فنی خصائص کو جو صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے تھے ، ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ ادق موضوع عام قاری کے لیے بھی دلچسپ اور جاذب توجہ ہو گیا ہے - علمی مطالب کو بیان کرنے کا جو سلیقہ خاص انہیں حاصل ہے اس کے طفیل وہ فن تاریخ گوئی کے باریک مسائل کو بھی بڑی عمدگی سے بیان کرتے چلے گئے ہیں - ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ ژرف نگاہی اور دقت نظر کے باوجود انداز بیان کہیں بھی پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہونے پایا - طرز بیان کی دل فریبی نے موضوع کو پانی کر دیا ہے - یہ فن کے ماہرین ہی کے لیے نہیں بلکہ مبتدیوں کے لیے یکساں طور پر مفید اور کار آمد ہے -

کپتان صاحب ایک ایسے خانوادے کے چشم و چراغ ہیں جس نے ابتدائی برطانوی دور میں علم و ادب کی آب یاری کی اور فنون لطیفہ کی اس شاخ کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق جانا - ان کے والد بزرگوار مولانا عزیز الدین اس فن کے شیدائی ہی نہیں خود ماہر اور منتہی تھے - ان کے کارناموں کی مختصر سی جھلک بھی اس کتاب میں درج ہے - کپتان صاحب اگرچہ اس بطل جلیل سے تربیت حاصل نہ کر سکے کیونکہ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے لیکن اسی علمی روایت کے وہ تنہا وارث ہیں - یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم کو دوام ہی نہیں بخشا ، بلکہ نئی نسل پر بھی احسان کیا ہے -

(۷)

ہمارے معاشرے میں مادی زندگی کو کچھ ایسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ علوم و فنون کے قدیم سرمائے کی طرف سے لوگ غافل ہوتے جا رہے ہیں۔ نئے علوم کا حصول یقیناً مستحسن ہے لیکن کوئی قوم اپنے ماضی کے علمی و ادبی سرمائے سے یک سر رو گردانی کر کے ملی تشخص کی متاع گراں ارز کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جدیدیت کی بنیادیں اسی وقت استوار ہو سکتی ہیں جب ان کا رشتہ قدیم سے قائم رہے۔ اس لیے علم تاریخ گوئی، لغز و معما، معانی و بیان و بدیع، عروض و قوافی کی تدوین جدید نہایت ضروری ہے۔ کیپٹن صاحب نے تاریخ گوئی سے اس کا آغاز کیا ہے۔ خدا کرے اب ادب کی دوسری متذکرہ شاخوں کی نوبت بھی آئے اور ہماری موجودہ نسل ماضی کے علمی خزائن سے آشنا ہو کر قومی و ملی عزائم کو مثبت بنیادوں پر استوار کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۹۷۲ء)

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

ولله المشرق والمغرب